انسان اور کائنات

افتخار احمد افتخار



حسن ترتیب

انسانوں کی عظیم اکثریت اپنی زندگی جہالت کے اُن اندھیروں میں گزار رہی ہے جہاں صرف ظاہر پرستی کا رواج ہے جہاں بوسیدہ روح کی موجودگی میں خوشی کا جواز تلاشا جاتا ہے۔اُن کی زندگیاں سراب منزل کے اُس الجھاوے کی نظر ہو رہی ہیں جن کی بنیاد قدیم نظریات پر رکھی ہے۔ دور دور جہاں تک نظر جاتی ہے انسان کی درماندگی اور ذہنی پستی کا عکس ہی واضح ہوتا ہے اس لیے کہ زمین و آسمان، بحر و بر اور نگاہوں کے سامنے پھیلی ہوئی بسیط کائنات کے بارے میں انسان کے نظریات کی بنا اُن سائنسی انکشافات پر رکھی ہے جن کی بنیاد میں خالق کا انکار کارفرما ہے۔اس کے نتیجے میں انسان اپنی زندگی کے ہر پہلو میں مادیت کی طرف جھک گیا ہے اور روحانیت سے منہ موڑ لیا ہے۔مغرب نے کائنات کے بارے میں اپنے نظریات کا بہت زیادہ چرچا کیا ہے جب کہ مسلمانوں کے ہاں سے اس کا جواب کم کم ہی دیا گیا ہے۔ ہر چند کہ یہ ایک ظاہر حقیقت ہے کہ انسان کے کائنات کے بارے میں نظریات اُس کی زندگی کے ہر عمل اور ہر تخیل پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کائنات کے بارے میں اہل مغرب کے کھوکھلے نظریات پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے تا کہ اصل حقیقت کو واضح کیا جا سکے اور زندگی کی راہوں میں نظریات اور تخیلات کے اندھیروں میں روشنی کی اِک شمع جلائی جا سکے تا کہ انسانوں کو راہِ حق تلاش کرنے میں دشواری نہ ہو۔

افتخار احمد افتخار



اِک ہجوم آدم ہے جو ہر طرف دکھائی پڑتا ہے۔ بازاروں، ائیر پورٹ، ریلوے اسٹیشن اور شاہراؤں پر انسانوں کا یہ ہجوم ایک بے منزل مسافرت کے آزار میں نظر آتا ہے۔ اگرچہ خود ہر انسان کا یہی خیال ہے کہ وہ اپنی منزل کی جانب رواں ہے اور جلد ہی اسے حاصل بھی کرلے گا۔ مگر کیا حقیقت میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے، یہ ایک سوچنے والا سوال ہے؟ کیونکہ اگر آسودگی کی کسی منزل پر پہنچ کر، کامیابی کی کسی سیڑھی پر کھڑے ہوکر، دوسروں سے برتر مقام حاصل کرکے، لوگوں کے حقوق روندکر، اقتدار حاصل کرکے، دولت کے انباروں پر براجمان ہوکر، کاروباری رفعتوں کو چھوکر، سماجی بلندیوں پر مقیم ہوکر، چاند پر چہل قدمی کرکے بھی انسان یہ نہیں کہہ سکا کہ وہ خوش ہے، اسے دُکھ سے نجات مل گئی ہے، اُس کی ہر خواہش پوری ہوگئی ہے اور وہ زندگی سے اور کچھ نہیں چاہتا، تب تو بات کچھ سمجھ میں آتی مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ انسان اپنی تاریخ کے کسی بھی پڑاؤ پر مطمئن اور آسودہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ کسی نہ کسی ایک ہدف کے پیچھے ہلکان نظر آتا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ سکندرِ اعظم کا ہدف اور ہوگا اور ایک ریڑھی بان کا ہدف اور۔ پھر بھی اس سے حقیقت کی ماہیت میں کوئی

بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ انسان صدیوں سے سعی کرتا رہا ہے کہ وہ اس وجہ کو جان پائے کہ کیوں ایک ہدف کو حاصل کر لینے کے باوجود بھی وہ اُس سکون اور خوشی کو حاصل نہیں کر سکا جس کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ ہدف پورا ہونے کے بعد اس کو حاصل ہو جائے گی۔ لوگوں نے اس بارے میں اپنی رائے قائم کی ہے اور صاحب دانش لوگوں کی ایک جماعت ہمیشہ سے اپنے نظریہ واستدلال سے لوگوں کو آگاہ کرتی رہی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ جب راہبر ہی راہزن ہوں تو وہ انسانوں کو اسی راہ کی طرف بلائیں گے جس پر وہ خود چلے۔ اسی امر کو ذہن میں رکھتے ہوئے آگے چلیں تو ہم جانیں گے کہ جب دنیا سے مسلمانوں کا ہزار سالہ اقتدار رخصت ہوا تو اس کے بعد لوگوں کی راہنمائی کرنے والے خود کیسے لوگ تھے۔ ڈارون انسان کو بندر کی اولاد کہتا ہے تو مارکس دولت کے حصول و تقسیم میں انسان کے دکھوں کی نجات دیکھتا ہے اور فرائیڈ انسان کے ہر عارضے کو جنس کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا کہ وہ لوگ جو خود گمراہ تھے اور پرلے درجے کے احمق بھی تھے وہ کیسے لوگوں کے راہبر بن بیٹھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں جب مغرب میں بیداری کی لہر اٹھی تو ابتداء میں اُن کا ہدف کلیسا کے بے پناہ اختیار کو کم کرنا تھا مگر یہ تحریک جب کامیابی کے قریب پہنچی تو اُن لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی جو مذہب سے بیزار تھے۔ چنانچہ کلیسا سے راہب کو نکالتے نکالتے انھوں نے اپنی ساری قوم کو ہی کلیسا سے نکال دیا اور ان کو مذہب سے آزاد کر دیا۔ انھوں نے مذہب کو لوگوں کا اختیاری معاملہ قرار دے کر اسے زندگی کے ہر شعبے سے رخصت کر دیا۔ اس کے نتیجے میں انسان اُس روحانی تشنگی کا شکار ہوا جس میں آج کا مغربی معاشرہ مبتلا ہے اور اس کے آزار گنائے نہیں جا سکتے۔

تاریخ کے دریچوں میں جھانکیں تو ہم جانیں گے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب اہل مغرب مسلمانوں کو مکمل طور پر مغلوب کرنے میں کامیاب ہو گئے تو انھوں نے اپنی فکری تہذیب کو دنیا پر غالب کرنے کی جہد وسعی کا آغاز کیا۔ ان سطور کو تحریر کرتے ہوئے آج اکیسویں صدی میں عمومی طور پر دنیا میں مغربی فکر و تہذیب کا غلبہ ہے اور مغرب نے اپنے معاشی، سیاسی اور حربی تفوق (Supremacy) کو اپنے فکری غلبے کا ذریعہ بنایا ہے اور وہ اپنی تہذیب کی عالمگیریت (Globalasation/Universalization) کی مہم پر کامیابی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب برائے نام ہی سہی مگر خلافت عثمانیہ موجود تو تھی جس کے زوال کے بعد اب مسلمانوں کا کوئی پرسان حال نہ تھا اور یہ ایک سنہری موقعہ تھا کہ مغرب مسلمانوں کے بچے کھچے اداروں پر بھی اپنے فکر و فلسفہ کو غالب کر دے۔ چنانچہ اہل مغرب نے مسلمانوں کے سیاسی

،معاشی، قانونی، سماجی اور تعلیمی نظریات میں اپنے فکر وفلسفہ کو کچھ اس غیر محسوس انداز سے داخل کیا جس کے زخم مسلمان کو آج تک اذیت دیتے ہیں۔ مغرب جب اندھیری رات (Dark age) سے باہر آیا تو اور اُس میں بیداری کی ایک لہر نے جنم لیا جس کو بعد میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کہا گیا۔ اس تحریک کے نتیجے میں مغرب سے روحانی مذہبی اور اخلاقی اقدار چھن گئیں۔ اگرچہ اہل مغرب دو صدیاں بیت جانے کے بعد بھی اس احساس زیاں سے گریزاں نظر آتے ہیں کہ اُن سے کچھ چھن گیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس سماجی، سیاسی، معاشی اور حربی میدانوں میں اُن کی کامیابیوں نے ابلیس کا کام بہت آسان کر دیا اور وہ لذت کوشی کے اُس عالم میں مدہوش ہو گئے جس کے نتیجے میں امریکہ میں پیدا ہونے والے سو میں سے ستر بچوں کو اپنے والد کا نام معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ جب عورت ہر رات کو ایک نئے شخص کے پہلو میں سوئے گی تو اسے خود بھی شاذ ہی معلوم ہو سکے گا کہ یہ حمل اُس کو کب اور کس سے ٹھہرا تھا۔ چنانچہ جب وہ خود بھی اپنے بچے کے باپ کے نام سے آشنا نہیں تو پھر وہ اپنے بچے کو کس طرح بتائے گی کی اُس کے والد کا نام کیا ہے۔ ریاست اس بچے کی پرورش کرتی ہے اور یوں ایک اور حرامی کو دنیا میں شیطان کے آلہ کار کے طور پہ زندہ رہنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔

جب وہ جوان ہوتا ہے تو اپنی محرومیوں کا انتقام افغانستان اور عراق کے بے گناہ لوگوں کا خون بہا کر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مغرب کے ان حرامیوں نے دنیا کا چہرہ خون سے آلودہ کر رکھا ہے اس لیے کہ اُس کی ہوس اور لالچ کی کوئی انتہا نہیں، کسی انتہا پر پہنچ کر یہ سفر رکنے والا نہیں۔ جو جرم اُن کی ماں نے کیا تھا اور اُس کا نامعلوم باپ اپنے نطفے سے لاپرواہ ہوا تھا تو اس میں کسی افغانی، سوڈانی، لبنانی، شامی، مصری، فلسطینی یا عراق کے شہری کا تو کوئی قصور نہ تھا مگر چونکہ یہ دنیا غالب کی دنیا ہے اس لیے آج وہ مغلوب مسلمان کا چہرہ خون سے رنگنے میں مصروف عمل ہیں۔ اُن کا یہ عمل دراصل تو اُن نظریات کا عکس ہے جو اُن کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں پیوست کر دیئے گئے ہیں۔ وہ نظریات کیا تھے اس کے لیے ہمیں پھر سے تاریخ کی راہداریوں کا رخ کرنا ہوگا کہ جب تحریک نشاۃ ثانیہ رونما ہوئی تو اُس کے اکابر نے یونانی فکر وفلسفہ کے احیا کی بنا ڈالی جس کے نتیجے میں سب سے پہلے فکری میدان میں آزاد روی اور حریت پسندی رونما (Liberalism) ہوئی۔ جس کا سب سے نمایاں مظہر پرانے ادب کا احیاء تھا۔ یہ تحریک دراصل یورپ کے مذہبی دور کے مقابل میں یونانی فکر و فلسفہ سے ذہنی وابستگی کی علامت تھی۔ پرانی دیو مالاؤں یونانی اور رومی وثنی ادب (Pagan Literature) کی طرف رجوع کیا گیا اور فکر و فن کے ہر میدان میں مذہب کی دی ہوئی

اقدار سے گریز بلکہ انحراف کیا گیا۔دوسری طرف مذہبی رجحان رکھنے والے لوگوں کے خلاف بغاوت اور تشدد کی ایک لہر در آئی اور مذہب سے بے زار لوگوں نے لبرل ازم کی بنیاد رکھی۔انھوں نے لوگوں کو الہام اور آسمانی ہدایت سے دوری اختیار کرنے کی دعوت دی اور زندگی کو عقل کے سہارے گزارنے کا خیال ظاہر کیا۔اسی کو بعد میں سیکولرازم کا نام دیا گیا۔پھر اس سیکولرازم(Secularism) کے بطن سے کیا کیا بلائیں نمودار ہوئیں اور انھوں نے انسان کو خالق سے کس قدر فاصلے پر لے جا کھڑا کیا۔عقلیت پسندی (Rationalism) کی بنا ڈالی گئی۔انسان کو کسی بھی خدا سے بے نیاز ہو کر محض انسانیت (Humanism) کے نام پر الگ سے ایک مذہب گھڑنے کی کوشش کی گئی۔پھر تجربیت (Empiricism) جیسی تحریکیں بھی اسی رجحان کی علمبردار تھیں۔مغرب میں جب یہ رجحانات پروان چڑھے تو لوگ جو پہلے ہی مذہب سے بیزار تھے انھوں نے سکون کا سانس لیا۔اہل مذہب کے ایک گروہ نے اگرچہ اصلاح مذہب(Reformation) کی تحریک بھی اٹھائی مگر اب دیر ہو چکی تھی اور لوگ کلیسا کے ظلم سے گھبرائے ہوئے تھے۔انھوں نے اس تحریک کو رد کر دیا تو اس خلا کو اُن تحریکات نے پر کیا جن کے مزاج میں مذہب بیزاری کا جذبہ موجود تھا اور یہی لوگ کامیاب رہے۔جس کے نتیجے میں آج کا مغرب وجود میں آیا جس میں اخلاقی و روحانی رویوں کا شدید فقدان ہے۔

مگر جب یہ تحریکیں کامیاب ہوئیں تو انسان کو انفرادی آزادی کے نام پر جن برائیوں کا تحفہ دیا گیا اُس نے ایک نئے انسان کو جنم دیا جو کسی بھی خالق کی غلامی سے مادر پدر آزاد تھا اور اب اُس کے سامنے صرف اُس کا نفس تھا جس کی ہر خواہش کو پورا کرنا ہی اس کا ایمان تھا۔چنانچہ آج مغرب کے ایک عام شہری کے دن کا آغاز شراب کی کلی سے ہوتا ہے۔پھر وہ سودی نظام کے دھارے میں بہتا ہوا دولت کے انتہائی لالچ میں مبتلا دن کو پورا کرتا ہے۔اب اُسے اپنی جسمانی پیاس بجھانے کے لیے ایک عورت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ ڈانس کلب کا رخ کرتا ہے جہاں اُسی کی طرح مرد کی متلاشی عورتوں کا ہجوم ہوتا ہے وہ اُن میں سے ایک کا انتخاب کرتا ہے اور رات گزارنے کے لیے اسے گھر لے جاتا ہے۔دن شروع ہوتے ہی یہ عارضی تعلق ختم ہو جاتا ہے اور ایک نئے دن کا آغاز ہوتا ہے اور پھر سے وہی شیطانی عمل شروع ہو جاتا ہے۔اب اُن کی حیوانیت جانوروں کی سطح سے بھی گر چکی ہے اس لیے کہ جانوروں میں بھی اس قدر اخلاق باختگی کا سراغ نہیں ملتا کہ اُن کے ہاں(Gay Club) ہوں یا اُن کی مادہ(Lesbian) ہو۔اُن کے ارباب اقتدار اور اہل دانش کا یہ حال ہے کہ کئی مغربی ممالک نے عورت کو عورت سے اور مرد کو مرد سے شادی کرنے کی قانونی

اجازت دے رکھی ہے۔اُن کے ہاں آئے دن (Nude Races) کا اہتمام کیا جاتا ہے جس سے اُن کی سماجی اور تہذیبی پس ماندگی کا کسی قدر اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔آج کا مغربی دانشور تمام آفاقی سچائیوں (Universal Truths) کو ماننے سے انکاری ہے اور ہر قسم کے عقائد کو (Meta Narratives) کہہ کر رد کر رہا ہے۔اس کے برعکس وہ اپنے معاشرے کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ جس تہذیب کے وہ پیروکار ہیں وہ اپنی منتہا (Peak) کو پہنچ رہی ہے۔اللہ ان کو غارت کرے اگر یہ انتہائے عروج ہے تو زوال کس کو کہیں گے۔

آج کی اس مادہ پرستی کے حصار میں مقید انسان کے پاس وقت ہی نہیں کہ وہ زندگی کے بارے میں ان چند بنیادی سوالوں کے جواب تلاش کرے کہ؛

میں کون ہوں؟

میں کہاں سے آیا ہوں؟

میں کیوں آیا ہوں؟

مجھے کہاں جانا ہے؟

یہ وہ چند بنیادی سوال ہیں جن پر غور وفکر کرنے سے انسان کی زندگی کے ہر پہلو میں تبدیلی در آتی ہے اور وہ مادیت کی مہیب دیواروں کے پیچھے جھانکتی روحانیت کا کسی قدر ادراک حاصل کر سکتا ہے۔یہ اُس کی بدقسمتی ہے کہ اُس نے اپنے ہر آزار ہر دکھ کا مداوا مادیت میں تلاش کیا ہے۔اگرچہ خالق کی موجودگی کے سبب کئی اور در ایسے تھے جن کو انسان نے نظر انداز کیا اور اپنی منزل کھوٹی کی۔آئندہ صفحات میں ہم انھی وجوہات کی کھوج لگانے کی کوشش کریں گے کہ ایک عاقل و بالغ انسان کیسے اپنے خالق کے وجود سے پہلو تہی اختیار کر سکتا ہے اور وہ کون سے نظریات ورجحانات تھے جنھوں نے اس سے ہر احساس لطیف کو چھین لیا اور وہ صرف نفس ہی کا پجاری ہو کر رہ گیا۔یہی ہمارے اس مطالعے کا مقصود ومنتہا ہے اوران اوراق میں ہماری یہی کوشش ہوگی کہ آج کے نام نہاد مہذب انسان کو نفس کی غلامی سے اٹھا کر خالق کے در پہ جھکنے کی طرف مائل کیا جا سکے۔

اللہ ہماری مدد اور راہنمائی فرمائے۔



مغرب، آج اور کل

زندگی کے ہزاروں رنگ ہیں اور ہر رنگ کا عکس اُس حیات پہ منعکس ہوتا ہے جو اِن رنگوں میں سے کسی رنگ کو اختیار کرتا ہے۔ ایک مواحد کی حیات پہ توحید کا رنگ غالب ہوگا، ایک کافر پہ شرک کا رنگ غالب ہوگا، مادیت پرست پہ ہوس کا رنگ غالب ہوگا، فلسفی کا ذہن الجھی ہوئی موشگافیوں کی آماجگاہ ہوگا تو ایک الحاد پرست کے ذہن سے انکار ہی کی صدا آئے گی۔ الغرض زندگی کے ہزاروں رنگ ہیں اور ہر رنگ کا انداز جدا جدا ہے۔ ان صفحات میں ہم انسانی زندگی اور اُن کے ذہنی رویوں کا جائزہ لیں گے۔ جس طرح معاشرت لوگوں کے احساس اور رویوں پہ گہرے اثرات چھوڑتی ہے اسی طرح تاریخ بھی انسانی رویوں اور ترجیحات کو متعین کرتی ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی اقوام اور مذاہب پر نگاہ ڈالیں تو اہل مغرب تمام کے تمام کامیابی کے ایک تصور پر یکجا دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کو اگرچہ ایک الہامی مذہب کے پیروکار ہونے کا دعویٰ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے دینِ عیسوی کو گرجا گھر میں مقید کر دیا ہے۔ اُن کے خیال میں مذہب ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے وہ چاہے

تو اس معاملے میں سرگرم رہے چاہے تو اُسے پس پشت ڈال دے۔اول اول جب اُن کے ہاں اس تصور نے جنم لیا تو مذہب سے والہانہ وابستگی رکھنے والوں کی تعداد زیادہ تھی اور مذہب سے منہ موڑنے والوں کی تعداد کم تھی۔تاہم نفس ہمیشہ ہدایت کی پیروی میں آڑے آتا ہے اس لیے رفتہ رفتہ اہل مغرب تمام تر مذہب سے بیگانہ ہوتے چلے گئے اور نفس کے بندے بن کے رہ گئے۔انھوں نے آسمانی ہدایت کو چھوڑ دیا اور اُن لوگوں کی پیروی شروع کر دی جو مادیت اور الحاد کی طرف مائل تھے۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اہل مغرب کے اعمال و افعال پر تاریخی تناظر میں بھی ایک نظر ڈال لی جائے کہ انکار کی عادت صدیوں میں پختہ ہوتی ہے۔مادیت اُن میں ہمیشہ سے موجود رہی تھی اسی لیے تو وہ ذرا ذرا سے فائدے کے لیے اللہ کی آیات کو بیچ دیا کرتے تھے، وہ جانتے تھے کہ اللہ کے رسول اُن کو جس بات کی طرف بلا رہے ہیں وہی سچ ہے۔اس کے باوجود انھوں نے اپنے نفس کی آواز پر کان دھرے اور اللہ کے احکام کا انکار کیا۔اللہ کے رسولوں کا انکار کیا۔اللہ کے رسولوں کو اذیت پہنچائی۔اللہ کے رسولوں کا راستہ روکا۔اللہ کے رسولوں کو قتل کیا۔یہی وجہ ہے کہ انھیں ایک مردود قوم قرار دے دیا گیا۔

آج دو ہزار سال ہونے کو آئے اِن اقوام کے طرزِ عمل میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔وہ کل بھی گمراہ تھے وہ آج بھی گمراہ ہیں، اللہ کے نازل کردہ قوانین کا انھوں نے کل بھی انکار کیا تھا اور آج بھی وہ انکار پہ ہی کاربند ہیں۔وہ کل بھی نفس کی پکار پہ مطمئن تھے اور آج بھی آوازِ نفس ہی اُن کی منزل ہے۔کل بھی فحاشی اور بدکاری اُن کو مرغوب تھی اور آج بھی شہوت رانی کی دنیا میں سب سے آگے وہی ہیں۔کل بھی اُن کی آنکھوں میں حیا نہ تھی آج بھی اُن کی آنکھوں میں حیا نہیں ہے۔کل بھی ذرا سے فائدے کے لیے وہ عدل سے پھر جاتی تھیں آج بھی اُن کا جھوٹ ضرب المثل ہے۔کل بھی دوسروں کا حق کھا جانا اُن کا شیوہ تھا آج بھی مادیت ہی اُن کی منزل قرار پائی ہے۔کل بھی وہ کتاب اللہ کے انکاری تھے آج بھی انھیں کتاب اللہ کی کوئی پرواہ نہیں۔کل بھی وہ مسلمانوں سے حسد کرتے تھے آج بھی وہ مسلمانوں سے حسد کرتے ہیں۔ کل بھی وہ اللہ کا حکم ماننے کے لیے تیار نہ تھے آج بھی وہ اللہ کا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں۔کل بھی وہ عقل کے اندھے تھے آج بھی وہ عقل کے اندھے ہیں۔کل بھی وہ شراب کے رسیا تھے آج بھی وہ شراب کے بغیر نہیں جی سکتے۔کل بھی سود اُن کی محبوب معیشت تھی آج بھی سب سے بڑے سود خور وہی ہیں۔کل بھی وہ ظالم تھے آج بھی وہی ظالم ہیں۔کل بھی وہ بزدل تھے آج بھی وہ بزدل ہیں۔کل بھی وہ جاہل تھے آج بھی وہ جاہل ہیں۔کل بھی وہ جھوٹے تھے آج بھی وہ جھوٹے ہیں اور اُن کے جھوٹ کی گواہی دیتے تاریخ کے صفحات سیاہ ہو رہے ہیں۔یہ اگرچہ

ایک طویل تذکرہ ہے کہ مغرب کا وہ معاشرہ جو آج ہمارے سامنے ہے جس نے دنیا بھر کے لوگوں کو مادیت اور الحاد کی دعوت دی ہے وہ کن راہوں سے گزرتا ہوا پستی کے اس مقام تک پہنچا۔ آج کے مغرب کی شہوت رانی، مذہب سے دوری اور دولت اکٹھی کرنے کی ہوس کن بنیادوں سے ظاہر ہوئی۔ مختصراً اُن کا جائزہ لیے بغیر شاید بات پوری طرح واضح نہ ہو سکے۔ چنانچہ مورخین نے اس طویل تر تاریخی تسلسل کو بیان کیا ہے اور الہامی کتابوں نے بھی قوم یہود و نصاریٰ کے پست روز و شب کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اُن کی مدد سے ہم اُس بگاڑ کو جاننے کی کوشش کریں گے جو آج ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا چاہتا ہے۔

حالانکہ وہ ایک الہامی مذہب کے پیرو تھے ایک الہامی کتاب کے وارث تھے اور اُن کے دعویٰ کے مطابق تو وہ آج بھی اُس کتاب پہ کاربند ہیں مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اہل مغرب کا اب کسی بھی کتاب سے حقیقت میں کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ محض نفس کے پجاری ہیں اور نفس کی آواز ہی اُن کا عمل ہے اور وہ بے منزل مسافرت کے آزار میں ہیں۔ جہاں تک اُن کی کتاب کا تعلق ہے تو اِس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کتاب سے نوازا تھا اور وہ کتابِ ہدایت تھی۔ آج کا مغربی معاشرہ جن بنیادوں پر استوار ہوا ہے اُن میں کچھ موہوم سا عکس تو اُس کتاب کا ہے جو اُن پہ اتاری گئی مگر بدقسمتی سے وہ عکس بھی اُن کی عبادت گاہوں اور سرکاری بیانات تک محدود ہو کے رہ گیا۔ ورنہ حقیقت میں تو مغرب کا عام شہری چاہے وہ امریکہ سے تعلق رکھتا ہو یا انگلستان سے، فرانس کا شہری ہو یا ناروے کا، آسٹریلیا کا باشندہ ہو یا ہالینڈ کا شہری ہو، جرمنی کا باشندہ ہو یا اسپین کا شہری، اٹلی کا باشندہ ہو یا سوئٹزر لینڈ کا رہنے والا ہو، طرزِ زیست میں کلی مشابہت رکھتا ہے۔ خیر و شر کا تصور ایک سا ہے، کامیابی و ناکامی کا معیار ایک ہے، جنسی انارکی، معاشی تصورات، سماجی اقدار، تہذیبی افکار اور تمدنی معاملات میں تقریباً اتفاق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انسانوں کا ایک انبوہ ہے جو حق و راستی سے آشنا نہیں۔ مغربی اقوام کے افکار کی بنیاد میں رومی تہذیب اور یونانی فلسفے کو بنیادی فکر و عمل کی حیثیت حاصل ہے۔

چنانچہ یورپی محققین نے اسلام سے تعصب کی بنا پر یونانی فلسفے کو کچھ اس طور پہ اور مبالغہ کی حد تک بیان کیا ہے کہ علم وحی پر بھی اُسے فوقیت عطا کر دی۔ حالانکہ خود یونانی مذہب کے لحاظ سے محض ایک تصوراتی داستان کو اپنائے ہوئے تھے اور اُن کا فلسفہ اُس الجھے ہوئے گورکھ دھندے کا نام تھا جس نے تین ہزار سال پہلے اگر انسانیت کی کوئی خدمت کی ہو تو کی ہو آج کی اس دنیا میں جب قرآن حکیم جیسی عظیم کتاب کُل عالم کو راہ نجات دکھا رہی ہے تو اُس قدیم یونانی فلسفے کو سورج کے مقابلے میں چراغ کی حیثیت بھی حاصل نہیں رہی۔ یونانی

فکر وفلسفہ کا بڑا بگاڑ یہ ہے کہ اُس میں روح کو قطعی طور پہ نظر انداز کر کے عقل کو لامحدود اہمیت عطا کر دی گئی۔ غالباً اسی بنیاد پر مغرب کے دانشور نے کہا کہ یونانی فکر وفلسفہ میں انسانی رفعت اور اس کی ایجابیت کو ثابت کیا گیا ہے۔ عقل کو لامحدود قرار دینے اور اسے روح پر مقدم کرنے کے نتیجے میں اُس انسانی تہذیب نے سر اٹھایا جس نے رفتہ رفتہ خالق کا بھی انکار کر دیا۔ اس لیے کہ جب ہر وجود کو ناپنے کا پیمانہ عقل ہی ٹھہری تو خالق کا وجود بھی اسی قدر قابل عمل تصور کیا گیا جہاں تک عقل کی رسائی ممکن ہو سکے۔ تاہم چونکہ اہل مغرب خود کو ایک الہامی مذہب کا پیرو گردانتے ہیں اس لیے ان کے ہاں بہر حال اللہ کے وجود کو عقل کے فریم میں نصب کرنے کی بھونڈی کوششیں جاری رہیں۔ رہ گیا اللہ کا روحانی عرفان تو اس کا وجود یونانی جاہلیت میں بہت ہی کمزور تھا۔ پھر رومی انداز فکر تھا جس نے جب عیسایت قبول کی تو بجائے اس کے کہ وہ عیسائیت قبول کرنے کی بنا پر اپنے فکر ونظر سے منحرف ہو جاتے انھوں نے عیسائیت کو اپنے اندازِ فکر کے مطابق ڈھال لیا۔ چنانچہ قرون وسطیٰ میں دین عیسوی کے اعتقادی انحطاط کے متعلق مشہور برطانوی مورخ DR, Draper اپنی کتاب "Combet in religion and Science" میں لکھتے ہیں کہ :

"منافقین کی وجہ سے عیسائیت میں شرک وبت پرستی داخل ہوگئی۔ اِن منافقین نے اپنے آپ کو عیسائی ظاہر کر کے بڑے بڑے مناصب پر قبضہ جما لیا خود کانسٹائن کا بھی یہی حال تھا اس نے اپنی ساری زندگی ظلم اور گناہوں میں گزاری اور سوائے زندگی کے آخری چند دِنوں کے اُس نے کبھی بھی کنیسہ کے مذہبی احکامات کی پابندی نہیں کی"۔



قرون وسطیٰ میں یورپ میں کلیسا کو زبردست اقتدار حاصل ہوا پھر بھی قانون الٰہی صرف شخصی احوال تک محدود ہو کر رہ گیا اور زندگی کے بڑے حصے میں رومی قانون ہی نافذ العمل رہا۔ گویا لوگوں کے ذہنوں پر مذہب کا غلبہ ہونے کے باوجود قرون وسطیٰ کے یورپ میں پائی جانے والی دین و دنیا کی آویزش قبیح جاہلیت کی مظہر ثابت ہوئی۔ معاشرے پر کلیسا کے اثرات نہایت گہرے اور دوررس تھے اور لوگوں کے ذہن کلیسا کی عظمت سے مرعوب تھے۔ اس کے باوجود بھی زندگی کے سارے معاملات رومی قانون کے تحت ہی حل کیے جاتے تھے۔ یہ ایک ارادی عمل تھا جو اہل کلیسا نے اپنایا اور اس طرزِ عمل کے نتیجے میں رومی قانون کی توسیع اور ہمہ

گیری کے لیے مواقع فراہم ہوتے رہے۔ نتیجہ کے طور پر دین و دنیا میں دوئی پیدا ہوئی۔ لوگوں کے اذہان متاثر ہوئے۔ تب لوگوں کے ذہنوں پر دین و دنیا کی دوئی اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ کاہنوں نے دنیا کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیا اور خود آسمانی بادشاہت کے وارث بن بیٹھے۔ تب یہ تصور عام تھا کہ جنت میں صرف وہی شخص جائے گا جسے کاہنوں کی خوشنودی حاصل ہو باقی سب اُس سے محروم رہیں گے۔ کلیسا کی گرفت معاشرے پر سخت تھی اس لیے کہ ریاست کی قوت اُس کی پشت پر موجود تھی۔ چنانچہ کلیسا عوام سے جو حکم چاہتا منواتا۔ کلیسا نے جہاں لوگوں کو عقلی طور پر یرغمال بنا رکھا تھا وہیں اُس نے لوگوں کا معاشی استحصال بھی کر رکھا تھا۔ وہ لوگوں سے عشر ایسے وصول کرتا جیسے کہ تاوان وصول کیا جاتا ہے۔
لوگوں کو مجبور کیا جاتا کہ وہ کلیسا کی زمینوں پر مفت کام کریں اور بادشاہ کے لشکروں میں بغیر کسی اجرت کے شامل ہوں۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں لوگوں پر خدا کی بجائے لوگ ہی حکمران تھے۔ اگرچہ کلیسا نے مذہب کے نام پر جاہلیت کا جو نظام وضع کیا تھا اُس نے نہ تو انسانیت کو کچھ دیا اور نہ ہی دین عیسوی کو لوگوں کا پسندیدہ مذہب رہنے دیا۔ رہبانیت کے لیے جو خانقائیں قائم کی گئیں وہ بدکاری کے اڈوں میں تبدیل ہو کر رہ گئیں اس لیے کہ فطرت سے بغاوت انسان کے لیے ممکن ہی نہیں۔ دراصل تو اہل مغرب کے لیے دین مسیحیت ایک قید تھی جس سے نکلنے کے لیے وہ بیتاب تھے۔ تاہم اُن کے حکمرانوں اور کلیسا نے جب اس بات کو محسوس کیا تو انھوں نے ایک نئی چال چلی۔ انھوں نے پوری قوم کو مجتمع کیا اور مسلمانوں پر چڑھ دوڑے حالانکہ وہ ابھی اس قابل نہ تھے کہ مسلمانوں کا مقابلہ کرتے۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جس کے آخر میں انھیں بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم یہ بات اُن کے فائدے میں گئی کہ لوگ دین مسیحیت پر ایک بار پھر مجتمع ہو گئے۔
صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے معاندانہ ٹکراؤ اور اسپین میں مسلمانوں سے مصالحانہ میل جول کا نتیجہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن بجائے اس کے کہ یہ نشاۃ ثانیہ اللہ کے راستے پر چلتی جو درحقیقت اسلامی تہذیب کی بنیاد تھی اس نے نہایت تندہی سے اسلام کا مقابلہ شروع کر دیا۔ اور یہ کلیسا کا ایک اور احمقانہ قدم تھا۔ کلیسا لوگوں کو جاہل رکھنا چاہتا تھا اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر لوگوں نے علم حاصل کر لیا تو وہ کلیسا کی تمام تر جاہلیت اور عیاریوں سے آگاہ ہو جائیں گے۔ جیسا کہ اصول تاریخ ہے کہ آزادی پسند لوگ ظالم حکمران کے لیے ہمیشہ دردسر رہے ہیں اس لیے کلیسا اپنی ظالمانہ حکمرانی کو قائم رکھنے کے لیے شجر آزادی کو جڑ سے کاٹنے کی کوشش میں لگا رہا۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ غیر دینی (Secular) بنیادوں پر بپا ہوئی جس کے

نتیجے میں رفتہ رفتہ لوگ عقیدے اور دین سے دور ہٹتے گئے۔اہل یورپ نے مسلمانوں سے علم سیکھا، تہذیب سیکھی اور نظریہ آزادی حاصل کیا، مسلمانوں سے تجربی علوم حاصل کیے اور انھی پر اپنی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی۔ یورپ نے مسلمانوں سے ہی ایک قوم بننا سیکھا۔مگر جب اُن کو کچھ قوت حاصل ہوگئی تو انھوں نے اندلس کے مسلمان اہل علم کو سزائیں دینے کے لیے خصوصی عدالتیں قائم کیں۔جلد ہی وہ دور آ گیا جب تحریک اصلاح مذہب کے ساتھ ساتھ صنعتی انقلاب کی صدائیں بھی سنائی دینے لگیں۔وہ نظام سرمایہ داری کے ابتدائی ایام تھے جس کی بنیادیں سود دھوکہ اور فریب پر رکھی ہوئی تھیں۔محنت کش کو اُس کی محنت کا انتہائی کم معاوضہ دیا جاتا۔صنعتکار نے محنت کش پر انتہائی مظالم ڈھائے اور اُن کا خون چوسا تب کلیسا میں پراسرا خاموشی تھی۔بجائے اس کے کہ کلیسا اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا مگر دینی مصلحین تو وجدان کی اصلاح کے چکر میں الجھے ہوئے تھے۔ یہ سارا تذکرہ گیارہویں صدی عیسوی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک کا تھا۔پھر جب انیسویں صدی کا سورج طلوع ہوا تو اُس کے دامن میں اہل مغرب کے لیے بہت کچھ تھا بلکہ وہ سب کچھ تھا جس کے وہ متمنی تھے اور جسے وہ ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے تھے اور انیسویں صدی میں انھوں نے جو کچھ بھی حاصل کیا وہ دین اور عقیدے کی قیمت پر حاصل کیا۔اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں ہی اُس بلند و بالا اور عظیم تر صنعتی انقلاب کی بنیاد رکھی جا چکی تھی جو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی وجہ بنی۔چنانچہ انیسویں صدی اُن کے لیے نئی روشنی کی صدی ثابت ہوئی۔ جہاں ڈاروینیت نے اُن کے افکار و نظریات کو روند ڈالا تو وہیں صنعتی انقلاب نے اہل مغرب سے اُن کے آبائی عقیدے کو بھی چھین لیا۔

انیسویں اور بیسوی صدی کو اگر اہل مغرب کی صدی قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا اس لیے کہ علم و فضل ہو یا فن و حرب، صنعت و حرفت ہو یا تجارت و معیشت ہر میدان میں مغرب کا ڈنکا ہی بج رہا تھا۔تاہم بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب مسلمانوں کے مقبوضہ علاقوں پر مغرب کی گرفت کمزور ہوئی تو مسلمان بھی میدان عمل میں نکل آیا اگرچہ وہ زیست کے متعدد میدانوں میں ابھی تک مغرب سے کوسوں پیچھے ہے۔مگر سچ تو یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین کی قیمت پر اُس مادی آسائش کو حاصل کرنے پر کبھی رضامند نہ ہوا جس کا مغرب متمنی تھا۔ مغرب نے معاشیات اور سماجیات میں جو میدان سجائے اُن میں اُسے اگرچہ کامیابی حاصل ہوئی۔مگر مادیت کی آخری منزل پر پہنچ کر جب اُس نے پیچھے دیکھا تو اُس نے جانا کہ وہ بہت کچھ کھو آیا ہے۔نسلوں پہ نسلیں بدلتیں رہیں جس کی وجہ سے اُن کے اندر سے رفتہ رفتہ احساس زیاں بھی جاتا رہا۔یہ سچ ہے کہ مغرب عسکریت اور معاشیات کے میدانوں میں دوسری بہت سی اقوام سے آگے نکل چکا ہے۔مگر یہ بھی سچ ہے کہ

اُن کے ہاں انفرادی سکون مفقود ہے۔ اُن کا فرد انفرادی طور پہ ایک اضطراب کا شکار ہے اور اُس سکون کا متمنی ہے جو اسے مادیت کی انتہا پر پہنچ کے بھی نہیں مل سکا۔ صاحب دانش لوگوں نے اس امر کو جانا ہے کہ انسان روح اور جسم سے مرکب ہے۔ روح کی آسائش خالق کی اطاعت میں ہے اور جسم کی آسائش مادیت میں ہے۔ تو جب انسانوں کے ایک کثیر گروہ نے روحانیت کو پس پشت ڈال کر صرف مادیت کو اپنی منزل بنالیا تو منطقی طور پر اُن کی روح تشنہ رہ گئی اور یہ اضطراب اسی تشنگی کا مظہر ہے۔ مغرب نے خاندانی ڈھانچے کو کھودیا ، محبت اور مروّت کے رشتوں سے منہ موڑ لیا، وہ صرف نفس کا پجاری بن کے رہ گیا۔ مادیت اُس کی منزل اور شراب اُس کی خوراک اور شہوت اُس کی لذت بن کے رہ گئی۔ سود اُس کا کاروبار اور استحصال اُس کا طرز زیست بن کے رہ گیا۔ مغرب نے انسانیت کو کئی ہزار ایٹم بم اور تیسری دنیا کا تحفہ دیا۔ دراصل تو یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ مغرب نے منزل کے تعین میں ٹھوکر کھائی انھوں نے قولاً تو خالق کے وجود کا انکار نہ کیا مگر عملاً انھوں نے خالق کے احکامات کو پس پشت ڈال دیا جس کی وجہ سے وہ اپنے اہداف حاصل کرنے کے باوجود منزل سے کوسوں دور ہیں۔ روحانی خلا کے ساتھ ساتھ اُن کے اندر ایک بڑے اخلاقی بگاڑ نے بھی جنم لیا جس نے نہ صرف اُن کی زندگی کو اجیرن کیا بلکہ مغرب نے دور دور تک انسانیت کا چہرہ لہولہان کر رکھا ہے۔ خاص طور پہ اُن کا ہدف مسلمان ممالک ہیں جو اُس کے تمام اہداف و مقاصد کو پورا کرتے ہیں مسلمانوں کے پاس تیل سمیت بے شمار معدنی دولت پائی جاتی ہے۔

چنانچہ عسکری اور معاشی حوالوں سے قدرے کمزور مسلمان ممالک مغرب کا ہدف ہیں جن پر وہ آئے روز حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔ مغرب نے مادیت کی منزل طے کرتے ہوئے سائنس کو اپنا معبود بنالیا۔ سائنس اگرچہ ایک مفید علم ہے مگر سائنس کو خدا بنالینا اہل مغرب جیسے کم عقلوں ہی کا کام تھا۔ علم سائنس کائنات کے بارے میں معلومات کا عمدہ وسیلہ ہے مگر سائنسی کارنامے دراصل اُس عقل ہی کے مرہون منت ہیں جو خالق کی طرف سے انسان کو عطا کی گئی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ مغرب نے سائنس کو الوہیت کے مقام پر بٹھا دیا اور اسے اپنی محبتوں عقیدتوں اور اطاعتوں کا واحد مرکز بنالیا۔ اہل مغرب کی اس افسوس ناک غلطی کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے تجرباتی سائنس کے تجربہ و مشاہدہ کے محدود وسائل کے سوا علم و معلومات کے باقی وسائل سے خود کو محروم کرلیا جس کے منطقی نتیجے کے طور پر مغرب کا عام آدمی منزل سے مزید دور ہوتا چلا گیا یہی مغرب کا انسانیت کو تحفہ ہے۔ انسان کے سامنے ایک وسیع کائنات پھیلی ہے مگر مغرب کی تنگ نظری کی وجہ سے تمام امکانات نظری و مادی سائنس کی ناگزیر محدودیتوں کی نذر ہو گئے۔ کیونکہ درحقیقت انسان جس علم کا محتاج ہے

وہ عقل سے اگلی منزل پہ حاصل ہوتا ہے۔ جب کہ سائنس جو عقل کے پروں سے اڑتی ہے انسانیت کی بلند پروازی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ وہ عقل اور روح دونوں سے مدد حاصل کرتی ہے اور تب کہیں اپنے خالق کا قرب اور حقیقت نفس الامری کا واضح اور صحیح شعور حاصل کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ مگر مغرب کا طریق مختلف تھا۔ اُن کا تخیل ہے کہ صرف سائنس ہی وہ واحد ذریعہ علم ہے جو حیات اور کائنات کے سربستہ راز منکشف کر سکتا ہے۔ اور اس تخیل میں وہ اس قدر پختہ ہیں کہ علم وحی جیسے مقدس علم کو بھی علم سائنس کے مقابل حقیر جانتے ہیں۔ اپنی جہالت اور کم فہمی کی بنا پر اہل مغرب شاید یہ نہیں جانتے کہ علم سائنس ہنوز اپنے ابتدائی دور میں ہے اور اب بھی بے شمار ایسے مسائل موجود ہیں جن کے بارے میں انسان کی معلومات نہ صرف محدود بلکہ قابل قدر حد تک ناکافی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علم سائنس کا دائرہ اثر کافی محدود ہے اس کا مشاہدہ سطحی اور اس میں صلاحیت نہیں کہ وہ حقیقت کی تہہ تک سفر کر سکے۔

دراصل جب مغرب نے مذہب یعنی روحانیت سے منہ موڑا اور جدیدیت یعنی مادیت اور سائنس کے دامن میں پناہ گزیں ہوئے تو انھوں نے پہلا دعویٰ یہ کیا کہ روح کچھ بھی نہیں یہ محض انسانی واہمہ ہے۔ اہل مغرب نے روح سے انکار کسی دلیل یا علم کی بنا پر نہیں کیا بلکہ اُس کی وجہ تجرباتی سائنس کی روح تک نارسائی اور ناکافی غیر موزوں آلات کا استعمال تھا۔ دراصل اہل مغرب اسرار فطرت کی نقاب کشائی سائنس کے ذریعے کرنا چاہتا تھے مگر وہ بھول گئے کہ سائنس تو محض ایک علم ہے جب کہ خالق کل عالم کا مالک ہے اور اُسی کا علم ہے جو لامحدود ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ دوسری طرف مشیت ایزدی یہ تھی کہ اعلیٰ حقائق کو انسانی ادراک کی براہ راست گرفت سے باہر رکھا جائے۔ یہی حکمت اور مصلحت تھی اور حکم ہمیشہ خالق ہی کا ہے۔ چنانچہ جب سائنس روح کے اسرار تک نہ پہنچ سکی تو اُن کم فہموں نے اسے سائنس کی محدودیت نہ جانا بلکہ روح کے انکار کو مناسب سمجھا اور یہی بات اُن کی ضلالت اور انکار کا باعث بن گئی اور انھوں نے آخری نتیجے کے طور پہ اس بات کا اعلان کر دیا کہ روح نامی کسی چیز کا دنیا میں کوئی وجود نہیں۔

الغرض آج کی جدید اور بزعم خویش مہذب دنیا علمی جہالت کا وہ شاہکار ہے جس میں دورِ جدید کا انسان مبتلا ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جدید یورپ قدیم یونانی تہذیب کا وارث ہے اور یہ تہذیبی ورثہ رومن ایمپائر کی وساطت سے یورپ تک پہنچا۔ قدیم یونانی تہذیب میں انسان اور اس کے دیوتاؤں کے باہمی تعلقات کی بڑی بھیانک تصویر پیش کی گئی ہے۔ یونانی دیومالا کے مطابق انسان اور اُس کے دیوتا ہمیشہ ایک دوسرے کے دشمن رہے۔ مورخین نے انسان اور یونانی دیوتاؤں کے مابین مستقل ٹکراؤ اور کھینچا تانی کی

کیفیت کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ قدرت کے سربستہ رازوں کو افشا کرنے میں انسان کو جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں وہ اُن کے نزدیک انسان کے عزم واستقلال اور دیوتاؤں کی عاجزی اور بے بسی کا اظہار ہیں۔ اُن کے مطابق اگر اُن کے دیوتاؤں کا بس چلتا تو وہ کبھی انسان کو تحقیق و اکتشاف کے کسی شعبے میں کامیاب نہ ہونے دیتے اور انسان اِن ساری آسائشوں اور سہولتوں سے محروم رہ جاتا جو قدرت کے خزانوں پر دسترس پانے کے نتیجے میں انسان کو حاصل ہوئی ہیں۔

اِس یونانی نقطہ نظر سے سائنس کی ہر نئی کامیابی اپنے حاسد دیوتاؤں کے خلاف انسان کی فتح و کامرانی کا نیا اعلان اور اُس کی برتری کا اثبات ہے۔ یونانی تہذیب کی یہی وہ خبیث روح ہے جو جدید یورپ کے تحت الشعور میں ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ اس کا اظہار کہیں تو حقائق و واقعات کی تعبیر و توجیہہ میں ہوتا ہے اور کہیں خدا کے بارے میں یورپی رویے میں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید یورپی سائنس دان سائنس کی کامرانیوں کو کچھ اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ گویا یہ انسان نے کسی برتر قوت سے لڑ کر حاصل کی ہیں اور اُن کے نتیجے میں فطرت کی قوتوں کو اپنا تابع فرمان بنالیا ہے۔ چنانچہ اَن دیکھے خداؤں کے سامنے انسان جس عجز و نیازمندی کا اظہار کرتا چلا آیا ہے اس کی اصل وجہ اس کے نزدیک انسان کا احساس عجز ہے۔ مگر سائنس کو فطرت کے خلاف جو بے پناہ کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں اُن کے نتیجے میں یہ انسانی احساس عجز رفتہ رفتہ خود بخود مٹ جائے گا اور بالآخر وہ دن بھی آئے گا جب انسان خود اپنا خدا ہوگا مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو حیات و ممات کے تمام سربستہ راز معلوم ہوں اور وہ تجربہ گاہ حیات میں تخلیق کی صلاحیت حاصل کرلے۔ انسان تخلیق کے امر پر قادر ہو جائے گا یہی آج کی سائنس کی نقطہ منتہا ہے۔

اس لیے آج کا سائنس دان تجربہ گاہ میں زندگی کی تخلیق کو جس معیار کی اولیت دے رہا ہے وہ کسی دیگر امر کو حاصل نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ آج کی دنیا میں اگر اُسے خدائی کا دعویٰ کرنا ہے تو اسے یہ سنگ میل عبور کرنا ہی ہوگا اور اس کے بعد انسان اور کسی اَن دیکھے خدا میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جائے گا اور انسان کو اپنے سوا کسی کے روبرو جھکنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ جدید مغربی دنیا آج جن روحانی امراض میں مبتلا ہے اُن میں یہ مرض سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اور اُن کے اس جنون نے انسان کی زندگی کو عذاب بنادیا ہے انسانیت کو افتراق و انتشار میں جھونک دیا ہے، زندگی میں امن وسکون اور اطمینان باقی ہے نہ حسن و دلکشی۔ چنانچہ مغرب کے یہ سب پست تخیل اور آخری حد تک پھیلا ہوا اخلاقی بگاڑ اُس کو کسی منزل کی طرف نہیں لے جائے گا۔ بلکہ وہ جس دلدل میں اتر چکا ہے وہ آگے جا کر مزید گہری ہو جائے گی۔ یہاں کوئی یہ نہ کہے کہ ہم نے ایک ارب

سے زائد بت پرستوں اور دوارب کے قریب ملحدین کا تذکرہ نہیں کیا تو انھیں معلوم ہو کہ زندگی کا جو طریق اِن لوگوں نے اپنایا وہ اہلِ مغرب سے چنداں مختلف نہیں۔ خالق کے وجود سے انکار یا خالق کے احکامات سے انکار ایک ہی قبیل سے ہیں۔ چنانچہ گمراہی اور اخلاقی پستی میں ہندو اور کیمونسٹ اہل نصاریٰ سے کئی قدم آگے ہیں۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ مغرب دراصل ایک استعارہ ہے اور اس دائرہ میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو خود کو سیکولر کہتے ہیں۔ چونکہ نظریات جغرافیائی سرحدوں کے پابند نہیں ہوتے اس لیے مشرق ہو یا مغرب انسانوں کا جو بھی گروہ سیکولر نظریات کا حامی ہوگا وہ گمراہ تصور ہوگا اور اُسے اہلِ مغرب ہی کہا جائے گا۔ چنانچہ اِن گمراہ قوموں کے سامنے اب صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اسلام کے دامنِ عافیت میں پناہ حاصل کر لیں۔ کیونکہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ قدیم زمانوں میں اول اول انسانی حماقت بت پرستی کی صورت ظاہر ہوئی اب سائنس کو خدا مان کر پھر سے اُسی جاہلیت کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان جب تک قدیم اور جدید خرافات سے خود کو آزاد نہ کر لے تب تک اسے حقیقی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اسلام ہمیشہ سے زخمی روحوں پر مرہم رکھتا چلا آیا ہے۔ آج بھی اسلام کا دامن وا ہے اور مغرب کو اس ضمن میں کسی رکاوٹ کا بھی سامنا نہیں اس لیے کہ وہ ایک غالب قوم ہیں۔ اسلام ہی سائنس اور مذہب کی اس مزعومہ کشمکش کو مصالحت میں بدل سکتا ہے۔ اسلام ہی انسانیت کے شرف کی بحالی کے لیے آخری جائے پناہ ہے اسلام ہی امید کی واحد کرن ہے، اسلام ہی اس مصیبت زدہ دنیا کی امن و سلامتی کو بحال کر سکتا ہے جو مغرب کی حماقتوں کے طفیل انسان سے چھن چکی ہے۔ بے خدا مغرب کی تباہ کاریوں سے نجات کے لیے قانونِ خداوندی کی اطاعت کے سوا اب کوئی چارۂ کار نہیں۔ اسلام انسان کو زندگی گزارنے کا وہ وسیع راستہ فراہم کرتا ہے جس کی آخری منزل پر خیر کی روشنی ہوگی۔ اسلام انسان پر اس امر کو واضح کرتا ہے کہ دنیا میں تجھے جو علمی مادی اور روحانی کامیابیاں نصیب ہوئی ہیں وہ دراصل تمھارے رب و رحیم کا فضل و کرم ہیں۔

اسلام انسان کو یہ پیغام دیتا ہے کہ اپنی کامرانیوں کو تم ابنائے نوع کی خدمت کا ذریعہ بناؤ گے تو تمھارا خالق تم سے خوش ہوگا اور تمھیں انعام سے نوازے گا۔ یاد رہے کہ تمھارا رب حصول علم کی لگن یا اسرارِ فطرت کی جستجو سے غضبناک نہیں ہوتا کیونکہ خالق کو اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اُس کی مخلوق میں سے کوئی اپنے علم کی بنا پر اُس کی خدائی کے لیے خطرہ بن سکتا ہے بلکہ خالق کا غضب صرف اُس وقت بھڑکتا ہے جب انسان اپنے علم و فضل اور سائنسی معلومات کو ابنائے نوع کی بربادی کا ذریعہ بنا لے۔ اسلام کا دامن عافیت ہر اُس انسان

کوسلامتی اور امن کی دعوت دیتا ہے جس میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت موجود ہو۔ چنانچہ خدا کرے کہ اہل مغرب بھی عصبیت وتعصب کے اندھے غاروں سے باہر نکلیں اور کھلے دل سے سچائی کا اعتراف کریں۔ اُن کے سامنے کامیابی کی یہ واحد صورت ہے ورنہ انھوں نے جس تصور کامیابی کو اپنایا ہوا ہے خود اُن کے اندر سے اب اس کے خلاف آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔ حقیقی کامیابی صرف خالق کے سامنے سر جھکانے میں ہے اور ناکامی خالق سے بغاوت کا نام ہے۔





تاریخ کا ایک اور در کھلتا ہے اور ہمیں اپنی عمیق گہرائیوں میں لے جاتا ہے جہاں اندھیرا تھا، سردی تھی ،کائنات تازہ تھی اور کھنکتی تھی، تخلیق کائنات کے متعلق آج اگرچہ ہم کچھ نہ کچھ جانتے ہیں مگر ہزار سال پہلے مطلق اندھیرا تھا اور صرف قرآن ہی تھا جس نے ہمیں بتایا کہ:

ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ وَھِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَھَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْھًا قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ۔

القرآن الحکیم (سورۃ حم سجدہ ۴۱؛ آیات ۱۱)

ترجمہ؛

”پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور یہ دھواں تھا تو اللہ نے اسے اور زمین کو کہا کہ تم دونوں برضا یا بغیر رضا اطاعت کرو تو انہوں نے کہا ہم بخوشی اطاعت کرتے ہیں“۔

آج کے انسان نے سائنس کے میدان میں ترقی کی بے پناہ منازل طے کی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ہماری یہ کائنات شروع میں چند گیسوں کا مجموعہ تھی (ہیلیم اور ہائیڈروجن وغیرہ) اور یہ بادلوں کی شکل میں تھیں۔ پھر ان بڑے بڑے بادلوں نے سکڑنا شروع کیا، خشک ہونا شروع کیا اور اس طرح اس پختگی کے نتیجے میں کائنات کی تخلیق کے ابتدائی مراحل کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ دولاکھ ارب سال (۲۰ نیل سال) پہلے کی بات ہے جب اس کائنات کا کوئی وجود نہ تھا، اس وقت ستارے تھے نہ سیارے مگر فضا میں ایک مادہ موجود تھا اس وقت یہ مادہ جمی ہوئی ٹھوس حالت میں نہ تھا بلکہ اپنے ابتدائی ذرے یعنی برقیے اور پروٹون کی شکل میں پوری فضائے بسیط میں یکساں طور پہ پھیلا ہوا تھا گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے ذرات کا ایک غبار تھا جس سے یہ کائنات بھری ہوئی تھی۔ یہ بادل سے قدرے مشابہ تھا اور ہر طرف دھواں دھواں سا تھا۔ قرآن نے اس کو لفظ ''دخان'' سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ ذرات کا یہ غبار یہ دھواں یہ بادل اس وقت اپنے توازن میں تھا اور اس میں کسی قسم کی کوئی حرکت نہ تھی۔ علم سائنس یہ کہتا ہے کائنات کی تخلیق اس توازن میں اس خلل کی وجہ سے معرض وجود میں آئی جو اچانک ہی کہیں سے نمودار ہو گیا اور ذرات کے اس بادل میں اضطراب پیدا ہوا جس نے اس خلل کو جنم دیا جو بڑھتا ہی چلا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہو گیا اور ستارے سیارے اور سحابئے وجود میں آ گئے۔ اس جمع شدہ مادے کے بہت سے حصے بکھرے ہو گئے ایک بہت بڑا حصہ سمندر میں گرا جو لاکھوں سال ٹھنڈا ہونے کے بعد زمین کی صورت وضع ہوا۔ کئی حصے بدستور گرم ہی رہے جیسے کہ سورج اور کئی وقت کے ارتقاء کے ساتھ ٹھنڈے ہوتے رہے جیسے کہ چاند اور مریخ وغیرہ۔

ان ستاروں، سیاروں اور سحابیوں کی باہمی مقناطیسی کشش اور زمین کی کشش ثقل نے ان کو متحرک اور گھومتے ہوئے اجسام میں بدل دیا اور یوں وہ نظام شمسی وجود میں آیا جس کا مشاہدہ ہم شب و روز کرتے ہیں۔ دخان سے مراد ایسا دھواں ہے جس میں پانی ملا ہو یعنی بخارات والا دھواں۔ یہ وہ لفظ ہے جو مرطوب گیسوں کے معنی میں بھی بخوبی استعمال کیا جا سکتا ہے اور یہی گیسیں وہ بنیادی مواد تھیں جن سے یہ کائنات وجود میں آئی۔ مگر چونکہ آج سے ایک ہزار سال پہلے کائنات کے متعلق کسی بھی قوم کے پاس اس قسم کا کوئی تصور موجود نہ تھا اس لیے ان آیات کے درست مفہوم تک رسائی ممکن نہ تھی جو تخلیق کائنات کے متعلق تھیں۔ اس وقت کی متمدن تہذیبوں یعنی رومنوں اور یونانیوں کے طریقیاتی علوم (Methodological Sciences) میں بھی اس طرح کا کوئی کائناتی تصور موجود نہ تھا۔ نہ بابلیوں میں اور نہ ہی میسوپوٹیمس کے ہاں اس طرح کا کوئی

تصور پایا جاتا تھا۔اس لیے مترجمین قرآن اس امر پہ مجبور تھے کہ لفظ دخان کو سادہ ترین معنی میں بدلیں اور شاہ رفیع الدین جیسے بلند پایہ عالم کو بھی لفظ ''دخان'' کے مقابل اردو زبان کے دامن سے کوئی ایسا لفظ نہ مل سکا جو اس کی اصل ماہیت سے قریب تر ہو۔ پھر اسی ترجمہ کو نواب وحید الزمان نے دہرایا کہ ''وہ بلند ہوا آسمان کو اور وہ دھواں سا تھا'' اور یہ ترجمہ پہلے سے بھی زیادہ اصل حقیقت سے دور ہو گیا اس پر تو اشتباہ عمومی پڑ گیا کہ وہ دھواں سا تھا۔ حالانکہ قرآن نے کہا کہ ''ھی دخان'' اور کسی قسم کا ابہام نہیں چھوڑا۔ یعنی مرطوب اور بخارات والا دھواں ۔حقیقت یہ ہے کہ آج کی سائنس گو بہت متمدن ہے مگر ابھی اس کو بہت سفر کرنا ہے اور تخلیق کائنات کے حقیقی منظر کے قریب پہنچنے کے لیے سائنس کی تھیوریاں قدرے ناپختہ اور نابالغ ہیں۔ اگرچہ سائنس اپنے درست رخ کی طرف سفر کر رہی ہے اور اس کی منزل ہے قرآن کے ایک ایک لفظ پہ مہر تصدیق ثبت کرنا۔ کیونکہ جب تک پورے قرآن کی حقانیت ثابت نہیں ہو جاتی، جب تک ایک آیت قرآنی میں بھی اشتباہ موجود ہے اس وقت تک اللہ تعالیٰ اس دنیا میں تحقیق وجستجو کے دامن کو تنگ نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ قرآن ہر حال میں اپنی حقانیت کو پورا کرے گا اور اللہ ہر حال میں سچا ہے۔ اب چاہے اس جستجو کا سفر مسلمان طے کریں یا کافر۔

مسلمان ابھی غفلت میں ہے مگر کافر جستجو کے میدان میں قدم اٹھا رہا ہے۔ میں جب یہ الفاظ سپرد قلم کر رہا ٹھیک اسی وقت میرے کان بگ بینگ کے اس تجربے کی طرف بھی لگے ہوئے ہیں جس کا آنکھوں دیکھا احوال فرانس سے براہ راست میری پشت پہ پڑا ٹیلی ویژن نشر کر رہا ہے۔ سولہ سال کی محنت، ہزاروں سائنس دانوں کی جستجو اور ستائیس ارب پونڈ لگا کے فرانس اور سویڈزر لینڈ کی سرحد پر پہاڑی علاقے میں ایک طویل سرنگ کھودی گئی۔ سرنگ کو تقریباً اسی درجہ حرارت تک ٹھنڈا کیا گیا جو بنگ بینگ کے وقت تھا۔ پھر اس میں ایک بڑا دھماکہ کیا گیا اور یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ بگ بینگ کے چند لمحوں بعد کائنات میں کون کون سی کیمیائی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ابھی اس تجربے کی تفصیلی رپورٹ آنا باقی ہے مگر فوری طور پہ اس تجربے سے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ کائنات کا اختتام بھی ایک دھماکے پہ ہو گا اور یہ کہ کائنات بالآخر تباہ ہونے والی ہے اور فانی ہے۔ میں جب قرآن پڑھتا ہوں تو مجھے اس امر تک پہنچنے کے لیے کہ یہ کائنات فانی ہے اور اس کا اختتام قریب ہے ستائیس ارب پونڈ تو کیا ایک پیسہ تک خرچنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی اور میں یقین کی ان سرحدوں کو پہنچ جاتا ہوں جہاں آج کا مغربی سائنس دان پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس بگ بینگ کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الانبیاء ۲۱۔آیات ۳۰)

ترجمہ:

''کیا یہ کافر لوگ دیکھتے نہیں کہ یہ زمین اور آسمان اکھٹے تھے پھر ہم نے انھیں پھاڑ کے الگ کر دیا اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا تو کیا وہ ایمان نہیں لاتے''۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

اللہ پاک فرماتے ہیں کہ زمین و آسمان پہلے اکھٹے تھے پھر ہم نے انھیں ایک دھماکے سے الگ کر دیا۔اس طرح کسی چیز کو پھاڑ کے الگ کرنا آسان نہیں ہوتا بلکہ یہ صرف پرور دگار ہی کی قدرتِ کاملہ کے تحت ظہور پذیر ہوسکتا ہے۔بگ بینگ کے تصور تک سائنس تو بہت بعد میں پہنچی اول اول نوع انسانی کو اس کی اطلاع قرآن ہی نے فراہم کی اور آج اس کی جزیات کو بھی سائنس ثابت کر رہی ہے جو آگے بڑھتے ہوئے مزید دھماکوں کی نشاندہی کر رہی ہے۔اگر ہم مندرجہ بالا آیات کریمہ پہ تفکر کی ذرا گہری نظر ڈالیں تو ہم جانیں گے کہ ایک '' Huge mass ''ہے جو دامن سے باطن کو پھٹ کر جدا ہو رہا ہے اور اس سے ہمارے زمین و آسمان تخلیق ہو رہے ہیں۔تخلیق کائنات کے حوالے سے یہ نقطہ بھی قابل غور ہے کہ جب پرور دگار عالم زمین و آسمان بنانے کی بات کرتا ہے تو ایک زمین یا ایک آسمان کی بات نہیں کرتا بلکہ سات آسمانوں اور سات زمینوں کی بات کرتا ہے۔

چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

اَللهُ الَّذِىْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَىْءٍ عِلْمًا○

القرآن الحکیم (سورۃ الانبیاء ۲۱۔آیات ۲۹)

ترجمہ:

''اللہ تو وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور سات زمینیں اور اس طرح کہ ان کے درمیان اس کا امر اترتا ہے تاکہ تم جان لو کہ بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے اور بے شک اللہ نے اپنے علم کے ساتھ ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے''۔



اگرچہ سائنس بہت عرصہ تک اس بات پہ مصر رہی کہ یہ سات زمینوں اور سات آسمانوں والی بات محض ایک افسانہ ہے۔ تاہم جب ان کے مشاہدے کو قدرے وسعت عطا ہوئی تو انھوں نے اس بات پہ غور کرنا شروع کیا اور اب ان کی سوچ قرآنی تصور کے قدرے قریب ہے اور وہ نظروں کے سامنے سجے اس نظام شمسی کے علاوہ دیگر گلیکسیز کے وجود کا یقین بھی حاصل کر رہے ہیں۔ اللہ پاک مندرجہ بالا آیات میں فرماتے ہیں کہ زمین و آسمان یعنی پوری کائنات کے مابین کوئی زمین ایسی نہیں کہ جہاں حیات کا بیج نہیں اگتا اور جہاں قانونِ خداوندی نہ اترتا ہو۔ آج کی سائنس اپنی جستجو سے حاصل ہونے والی کامیابیوں کا موازنہ جب الہامی علوم سے کرتی ہے تو اسے اپنی تنگ دامانی پہ شرمندگی سی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ خالق کے وجود سے انکار اور اس سے بے اعتنائی کے رویہ نے جب اس کا عکس خود ان کے میدانِ جستجو میں اتارا تو ان کو اپنی فکری پستی پہ غور کرنا ہی پڑا اور کتنے ہی ایسے خوش نصیب سائنس دان ہیں جنہوں نے جب خالق کی جولانیوں کا مشاہدہ اس عقلی میدان میں کیا جہاں ان کے خیال میں روحانیت کا تصور تک ممکن نہ تھا تو وہ بے اختیار پکار اٹھے کہ ہاں ہم مان گئے کہ وہ خالق ہے اور ہم اس کی ادنیٰ اور بے مایہ سی مخلوق ہیں۔ آج کی تحقیق اور متعدد سائنسی انکشافات انگنت شمسی وجودوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ۔ ان کا نظام شمسی اور مجموعہ ہائے نجوم (Constellation) ہماری زمین اور ہمارے سورج سے ہی مشابہ ہے۔ اب سائنس برملا اس بات کے اعتراف پہ مجبور نظر آتی ہے کہ ہماری کہکشاؤں جیسے بے شمار سورجوں کا وجود ہے۔ اگرچہ اس وقت تک سائنس اس کائنات میں کسی دوسری حیات کا سراغ نہیں ڈھونڈ سکی اور نہ کسی اور دنیا میں زندگی کا ظہور دریافت ہو سکا ہے۔ دراصل ہم لوگوں کی محدود عقل و معرفت اللہ کی کائنات کو صرف ہمارے سامنے کی کائنات تک محدود کرتی ہے جب کہ ''سبع سموات'' سے مراد ایسی کئی کائناتیں ہیں اور دیگر زمینیں اور آسمان اس لیے بھی ابھی انسانی آنکھ سے اوجھل ہیں کہ ہماری نظروں کے سامنے جو کائنات موجود ہے ابھی اس کی گہرائیوں پہنائیوں اور اتھاہ قوتوں کو سمجھنے میں بھی صدیاں گذر سکتی ہیں۔ آسمانوں کی بات کرتے ہوئے پروردگارِ عالم

نے سماوات یعنی جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے اور پھر آسمان دنیا کا الگ سے تذکرہ فرمایا ہے کہ ہم نے اسے چراغوں سے سجایا ہے۔

اَوۡحٰی فِیۡ کُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَهَا وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ ○

القرآن الحکیم (حٰمٓ السّجدہ ۴۱۔آیات ۱۲)

ترجمہ:

''اور ہم نے ہر آسمان میں اپنا حکم نازل کیا اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے سجایا''۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

اگر ہم اپنی ایک کھرب یا دو کھرب کے قریب کہکشانی وسعتوں کو دیکھیں تو ان میں ہمیں جو بے پناہ ارب ہا روشن سورج نظر آتے ہیں تو یہ آسمان دنیا کے چراغ ہیں۔قرآن حکیم ان ستاروں کو جلتے ہوئے چراغ یا روشن شدہ چراغ کہتا ہے اور چاند کو منور شدہ۔پورے قرآن میں ایک بھی آیت ایسی نہیں جس میں چاند کو از خود روشن کہا گیا ہو۔چنانچہ اگر اللہ کے وجود کا کوئی اور ثبوت نہ ہوتا تو بھی یہی ایک حقیقت کہ پندرہ سو سال قبل قرآن حکیم نے سورج اور چاند کے مابین اس فرق کو بیان کر دیا تھا انسان کو اللہ کی موجودگی اور اس کے وجود کا یقین دلانے کے لیے کافی تھی۔جس طرح جوش ملیح آبادی نے کبھی کہا تھا کہ ہم جیسے اہل یقین کو ثبوتِ حق کے لیے اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی۔چنانچہ یہ کائنات جو اپنے خالق کے وجود کی دلیل ناطق ہے ابھی اپنے اندر آسمانوں اور زمینوں کے بے انت اسرار چھپائے بیٹھی ہے۔درحقیقت پروردگارِ عالم کے نظام میں کوئی جھول کوئی کجی نہیں ہے اس لیے کہ وہ ایک کھلی کتاب کی طرح ہے جسے عقل کی آنکھ سے جب چاہے پڑھا جا سکتا ہے۔اس کے لیے یہ بھی شرط نہیں کہ پڑھنے والا اعتقاد اور یقین کی اس دولت سے مالا مال ہو جو اس کی وجہ شرف ہے اگرچہ بہتر یہی ہے۔چنانچہ نظام کائنات کا کوئی بھی جز، کوئی بھی کُل، ذرا سی بھی غیر سائنسی یعنی غیر اصولی نہیں۔اس لیے اصول کی زبان ان گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے جنہیں اسرارِ کائنات کہا جاتا ہے۔ذرا غور سے آفاق و انفس پہ نظر ڈالیں تو پروردگار کی ذہن کو مسحور کر دینے والی انگنت نشانیاں نظر کے سامنے دوڑ جائیں گی۔چنانچہ انسان نے اللہ کی دی ہوئی عقل کو جب بھی اسرارِ کائنات پڑھنے کے لیے استعمال کیا ہے تو حجابِ

کائنات سرِ کے ہیں۔ مثلاً ان نظری شہادتوں میں سے ایک شہادت ہبل ٹیلی سکوپ کے ذریعے ملی ہے کہ 11.5 بلین سال قبل کائنات میں پہلا دھماکہ ہوا جس سے کائنات کی عمر کا تعین کرنے میں مدد ملی اور ایک محتاط اندازے کے مطابق وہ 15 بلین سال ہے۔ اگرچہ یہ کائنات ہمارے احاطہ علمی تک ہی محدود ہے مگر کل کو یہ صورت بھی سامنے آسکتی ہے کہ ہم ایک کائنات کے کنارے پہ پہنچیں تو وہاں بے شمار کائناتیں ہماری منتظر ہوں کیونکہ اب یہ خیال تقویت پکڑ رہا ہے کہ بگ بینگ کے ذریعے صرف یہی ایک کائنات معرض وجود میں نہیں آئی تھی جس کا ہم نے تصور کیا ہوا ہے بلکہ کئی اور کائناتوں کا تصور بھی اب افسانہ نہیں رہا۔ قرآن تو پہلے ہی اس کے بارے میں اشارے کر چکا ہے۔ چنانچہ جلد ہی وہ وقت بھی آئے گا جب اس کائنات سے وراء مزید دنیاؤں میں ہنستی کھیلتی زندگی دریافت ہوگی اور اب یہ یقینی بات ہے صرف وہ وقت وہ فاصلہ وہ حجاب ابھی بیچ میں ہے جس کو سائنس اور علم کا نشتر چاک کرے گا۔ آج سائنس کو کتنی ہی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ حیرت سے اہل مشاہدہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پہ یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ آج سے 11.5 بلین سال پہلے جو دھماکہ (Big Bang) ہوا جس سے بے شمار (Galaxial Bodies) کا آپس میں تصادم ہوا۔ اس کی روشنی زمین تک اب پہنچی ہے اور اب آج کے سائنس دان اس بات کا دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ اگر ان کے پاس ہبل سے زیادہ طاقتور ٹیلی سکوپ موجود ہو تو وہ اس وقت کو بھی پا سکتے ہیں جب ہماری یہ کائنات شروع ہوئی تھی۔

چنانچہ اتنے بڑے (Galaxial Order) پہ جہاں اس کی وسعتوں پہ فاصلے ختم ہو جاتے ہیں جہاں Space ختم ہو جاتی ہے جہاں زمانہ صرف ایک اکائی رہ جاتا ہے کہ جس سے ہم فاصلے ماپ سکتے ہیں اور اس اصول کے تحت معمولی سے معمولی فاصلے کو بھی ماپا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ان فاصلوں کی لامحدود وسعتوں کے پیش نظر (Light Year) نوری سال کی اصطلاح وضع کی گئی۔ مگر جب انسان نے روشنی کی شعاع سے چلتے ہوئے ایک سیکنڈ کو لے کر اس کی بنیاد پہ فاصلے گنے تو معلوم ہوا کہ یہ کائنات اتنی بڑی ہے کہ اس کی وسعت کے سامنے نوری سال کا پیمانہ بھی ناقص پڑ جاتا ہے اور اب سائنسدان روشنی کی رفتار کے بلین ایر پیکٹ کی تیاری میں مصروف ہیں تا کہ کوئی ایسی اکائی وضع کی جا سکے جس کے بلین پیکٹ جمع کر کے ہم شاید کائنات کے ان وسیع ترین پیمانوں کو یا اس پھیلی ہوئی کائنات کی وسعتوں کو کسی قدر علم انسانی کے احاطہ میں لا سکیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ زمانہ اور سائنس یا تمام جدید علوم کا رخ یا قبلہ قرآن ہی کی طرف ہے۔ اس لیے کافر ہو یا مسلمان جو بھی اسرارِ کائنات کی تحقیق میں لگا ہے وہ دراصل ان قرآنی گتھیوں ہی کو سلجھانے

کی کوشش کر رہا ہے جن کی سمجھ کے لیے انسانی شعور ابھی ناپختہ ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ الہامی علوم تک درست رسائی کے لیے جس دقیق پس منظر اور جس گہرے تحقیقی شعور کی ضرورت ہے انسان کو اس رخ پہ سفر کرتے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ اسی نقطہ نظر کے مطابق مندرجہ ذیل آیات پہ نظر ڈالیں۔

وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ۝

القرآن الحکیم (سورۃ الذاریات ۵۱۔ آیات ۴۷)

ترجمہ؛

''اور ہم نے آسمان کو اپنے دستِ قدرت سے بنایا اور ہم ہی صاحبِ قدرت ہیں کہ کائنات کو وسیع سے وسیع تر کرتے جائیں''۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

تحقیق اس بات کی طرف روشنی ڈالتی ہے کہ سورۃ ''الذاریات'' کی یہ آیت سولہویں صدی تک ناقابلِ فہم تھی اور ہمارے علماء نے علم سائنس سے ناواقفیت کی بنا پر اس کو متشابہات قرآن کہہ کے جان چھڑا لی تھی اور تقریباً تمام مفسرین نے اس کا مفہوم زورِ باز و یا رزق لیا ہے جو کہ درست ترجمہ نہ تھا اور اسے محض لغوی مفہوم قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حاملین قرآن اپنے علمی تنزل کی وجہ سے اس آیت کی حقیقی معنویت کو واضح کرنے کے قابل نہ ہوئے اور علم وحکمت کی یہ میراث اغیار کو منتقل ہوگئی۔ تب یہ سعادت دورِ جدید کے مایہ ناز سائنس دان آئن سٹائن کے حصے میں آئی جب اس نے اپنی گہری تحقیق کے بعد مشہورِ زمانہ نظریہ اضافت پیش کیا جس میں اس نے کائنات کے پھیلاؤ کے اس تسلسل کی طرف اشارہ کیا جس نے اس آیت کے حقیقی معنوں کو واضح کیا۔ ٹیکنالوجی کی اس تیز رفتار ترقی کے باوجود انسان کی تحقیقات بالآخر عرصہ زماں تک آ کر رک جاتی ہیں اور بغیر اذنِ پروردگار کوئی نیا نقطہ کوئی نئی تحقیق انسان کو نہیں بخشی جاتی۔ میں نے بارہا اس ضمن میں سوچا ہے اور اِک کسک اس بابت میرے دل میں ضرور رہی ہے کہ آخر ہر نئی تحقیق اہل مغرب ہی کو کیوں سونپ دی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میری اس الجھن کا جواب بھی مجھے قرآن ہی سے ملا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حکمت کے جن معانی کو قرآن نے استعمال کیا ہے اس کے لیے مسلم وغیر مسلم کی کوئی قدغن ہی نہیں۔

چنانچہ کتاب المرتبت قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

يُّؤتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ البقرہ۲-۲۶۹)

ترجمہ:

"اللہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا کی گئی اسے خیر کثیر عطا کی گئی اور نصیحت تو اہل عقل لوگ ہی حاصل کرتے ہیں"۔



بدقسمتی کی بات ہے کہ ہمارے آباء نے اسلام کی اس مرکزی اساس کو نظر انداز کیا جو ایک مخصوص ذہنی رویے (Mental Apporach) کی تشکیل کرنا چاہتا تھا جس کی بنیاد تحصیل علم پہ ہو۔ایمان ہی کی تعریف کو لے لیں۔صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے اس بابت سوال کیا تو آپؓ نے جواب میں فرمایا کہ ایمان "بیم ورجا" کے درمیان ہے۔یعنی جسے تقدیر الٰہی کا خوف نہ رہا وہ بھی اللہ کی گرفت سے آزاد ہو گیا اور جس پہ اس خوف کا غلبہ بڑھ گیا وہ بھی عمل اور امید سے دور ہٹ گیا۔الغرض اسلام کا ذہنی رویہ تحصیل علم سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔

چنانچہ جب مسلمانوں سے علم کی محبت اٹھ گئی اور تاج وتخت کی حب بڑھ گئی تو ان کا زوال شروع ہوا۔حالانکہ ابھی کل کی بات لگتی ہے جب تقریباً تمام معلوم انسانی آبادیوں پہ مسلمان ہی حکومت کرتے تھے اور علم وعمل کا پیکر تھے۔ایک وقت تھا جب دنیا میں تین ہی بڑی اور طاقتور حکومتیں اور حکمران تھے اور وہ تینوں ہی مسلمان تھے۔جب یورپ پہ حماقتوں اور جہالتوں کا دور دورہ تھا تو اسلام کی عظمتوں کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف سلیمان ذیشان المعظم یورپ کے دروازے پہ دستک دے رہا تھا تو مغل شہنشاہ اکبر اعظم ماوراء النہر سے ایشیائے کوچک تک حکومت کر رہا تھا۔تیسری بڑی عالمی طاقت اس وقت سلطان عباس صفوی کی تھی جو مشرق وسطیٰ سے مشرق بعید تک حکمران تھا۔اکبر اعظم کے دربار میں ایک دفعہ جب برطانوی سفارت آئی اور ملکہ انگلستان کا ذکر بھی ہوا تو اس پہ اکبر اعظم نے اپنے وزراء سے استفار کیا کہ "ایں جزیرہ نما چرا است"۔

اب یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قرآنی علوم ہی وہ محوری اثاثہ ہیں جس کے گرد پوری کائنات کے علوم گھوم رہے ہیں یا اس بات کو اس طرح کہہ لیں کہ علمی طور پہ قرآن ہمیشہ زمانے سے آگے رہا ہے اور علم

وتحقیق اس کے تعاقب میں۔ اگر چہ منزل ابھی دور ہے مگر انسانی عزم وجستجو بھی متحرک ہے۔ چنانچہ بطلیموس کا زمانہ ہو یا گلیلیو کی دریافتیں یا دورِ جدید کے سائنسدان ہوپکنز یا آئن سٹائن کے تصورات ہر زمانے میں قرآن جدید تر رہا ہے۔ مگر اسے سمجھنا شرط ہے کہ فہم انسانی نے ابھی اپنے ارتقاء کا بہت کم سفر طے کیا ہے اور کائنات کی ان بعید سمتوں کی طرف ابھی انسان کے قدم نہیں پہنچے۔ ابھی انسان اِن آسمانوں کی عظیم ترین وسعتوں میں سے پہلے آسمان کی وسعتوں میں سے بھی نہیں گذرا مگر سات زمینوں کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ کائنات کی ان سات زمینوں کا دور پہچاننے میں انسان نے وہ اشارے وصول کرنے شروع کر دیئے ہیں جن پر گمان ہے کہ یہ کسی اور حیات اور سرزمین سے آئے ہیں۔ انسان نے پندرہ کھرب نوری سال کے فاصلوں پر ایک چمکتے ہوئے شہر کو دیکھنے کی کوشش ضرور کی ہے۔

قرآن اس حقیقت کو کچھ یوں بیان کرتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ المومنون ۲۳ ـ ۱۷)

ترجمہ:

”اور بے شک ہم نے تمہارے اوپر سات راستے پیدا کئے اور ہم اپنی تخلیق سے غافل نہیں ہیں“۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

کائنات کی ان وسعتوں کے علم اور تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ جب علم کا حصول تمام تر بدن کے لیے ہوگا یا ضروریات اور سامان تعیش کے لیے ہوگا تو ایسا علم انسان کی راہنمائی کبھی بھی منزل کی طرف نہیں کرتا اور مادی مقاصد کے تحت مزین کیے جانے والے علوم کبھی بھی انسان کے ذہن کو قرآنی علوم کو سمجھنے کی سطح فراہم نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے انسان کو علم کی اس شاخ کی طرف رجوع کرنا ہوگا جس سے اسے قلبی تسکین حاصل ہو۔ جسے وہ شناختِ حیات اور مقصودِ حیات کے لیے استعمال کر سکے جو اللہ کو، اس کائنات کو اور اس کائنات کے اغراض ومقاصد تک پہنچنے میں اس کا مددگار ہو۔ مگر یاد رہے کہ

کائنات کی شناخت کے موضوع کو کبھی بھی زمان و مکاں کے تصور سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں حقیقتیں ایسی ہیں جو باہم پیوست ہیں اور انسان ان کو الگ کرنے پہ قادر نہیں۔ اگرچہ آج کے اس متمدن عہد میں بہت سے سوچنے والے لوگ نظریہ اضافیت یا کوانٹم تھیوری کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس جستجو میں محو ہیں کہ وہ ماورائے کائنات کچھ ایسے اصول دریافت کر لیں جن سے فہم کائنات آسان ہو جائے مگر اس سے پہلے ہم اس سوال پہ غور کرتے ہیں کہ کیا انسان کے لیے کائنات کی تسخیر مقدر ہے۔ کیا انسان نے اس کائنات کو ہر صورت مسخر کرنا ہے یا اس کائنات کو اور اس کی تحقیق و جستجو کو محض خالق کی تلاش کے لیے ایک راستہ بنایا گیا ہے۔

گویا مسخر کائنات کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ ہم تحقیق و جستجو سے کام لے کر تھوڑے عرصے میں بڑا کام کریں اور رب کائنات کی حقیقت سے آگاہی حاصل کریں۔ تاہم اس کے لیے ہمیں ذرا پیچھے جانا ہوگا اور اس نقطہ آغاز کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا جب رب ذوالجلال نے حضرت آدم علیہ السلام کی شکل میں پہلے انسان کو اس کرۂ ارض پہ آباد کیا اور ساتھ ہی یہ ارشادِ مبارک بھی اتارا کہ:

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ○

القرآن الحکیم (سورۃ البقرہ ۲۔۳۶)

ترجمہ:

''تمہارے لیے زمین میں تھوڑا سا ٹھہرنا ہے اور ایک وقت مقرر تک فائدہ اٹھانا ہے''۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

یہاں اللہ پاک نے لفظ ''مستقر'' استعمال فرمایا ہے جو عارضی ٹھکانے کی اطلاع دیتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کرۂ ارض انسان کے لیے کوئی مستقل جائے قیام نہیں ہے بلکہ یہاں اس نے تھوڑا سا ہی ٹھہرنا ہے۔ چنانچہ انسان کی اس مختصر زندگی کو اگر کائنات کے وسیع تر تسلسل کے تناظر میں رکھ کے دیکھا جائے تو کوئی نسبت ہی نہیں بنتی کیونکہ اس کائنات کا چوتھا دور ساٹھ کروڑ سالوں سے اوپر شروع ہوتا ہے جہاں گنتی کے تمام مروجہ آلاتِ پیمائش معطل ہو کے رہ جاتے ہیں اور وہ کائنات جو ارب ہا نوری سالوں کے فاصلوں تک پھیلی ہوئی ہے جس کے ایک نوری سال کا ایک سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس حساب سے تو اتنی بڑی کائنات کی ذرا سی پرکھ کے لیے بھی انسانی زندگی نہایت مختصر ہے جس کے

ابتدائی بیس سال تو انسان کو اپنی حیات سے آگہی میں گذر جاتے ہیں اور آخری بیس سال ناتوانی میں باقی بچے بیس سالوں میں سے تقریباً آٹھ سال وہ سوتا رہتا ہے تو بارہ سالوں میں وہ ان گہرے اسرارِ کائنات کی کھوج میں کہاں تک جائے گا۔ یہاں اللہ پاک اپنے اس احسان کا ذکر فرماتا ہے جو اس نے صرف انسان پہ کیا ہے اور اس سلسلے میں باقی تمام مخلوقات سے بے اعتنائی برتی ہے اور انسان کو عقل و معرفت کی عطا جس کی مدد سے وہ مختصر وقت میں بھی خالق کی تلاش میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اسے بتایا گیا کہ خالق کی تلاش معبود حقیقی کی جستجو میں اسرارِ کائنات پہ غور و فکر کرنا ضرور اس کے کام آئے گا۔ قرآن میں انسان کو باقاعدہ طور پہ اس امر کی طرف مدعو کیا جاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران ۳۔۱۹۱)

ترجمہ:

"(اہل ایمان وہ لوگ ہیں) جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بیٹھتے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق پہ غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے میرے رب تو نے یہ سب کچھ بے مقصد نہیں بنایا تو پاک ہے پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے۔"

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

قرآن نے اپنے اس مقصد کو کبھی قاری کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا کہ وہ انسان کو خدا تک لے جانے کے لیے آیا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی اس امر کو بہ تخصیص بیان فرمایا ہے کہ اپنے رب کو پہچاننے کے لیے اپنی ذات پہ غور کرو۔ چنانچہ سورۃ آل عمران کی مندرجہ بالا آیات کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق پہ غور کرنا اور یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ کائنات کی ان وسعتوں کا خالق کون ہے؟ مالک کون ہے؟ سنت ابراہیم علیہ السلام ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہی اعزاز بخشا گیا۔ وہ ایک

ایسی دنیا میں پیدا ہوئے جہاں ستارے خدا تھے جہاں علم نجوم کو آخری علم کا درجہ حاصل تھا۔ تب سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے محض غور وفکر کے ذریعے لا الہ سے الا اللہ کی منازل طے کیں۔ انھوں نے نجوم وسموات اور شمس وقمر کو خدا ماننے کے بجائے ان کے خالق کی کھوج میں اپنی جستجو اپنے تدبر اور عمیق تفکر سے جانا کہ خالق کون ہے اور بالآخر وہ اپنے اس ترجیحی طریقہ کار کے ذریعے اپنے اللہ تک جا پہنچے۔ اگر ہم جستجوئے خداوند اور معرفتِ کائنات کے حوالے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھیں تو انھوں نے کوئی نیا کائناتی اندازِ فکر نہیں دیا اور تحصیل علوم یا علم کائنات میں وہ کوئی بڑا نام نہیں سمجھے گئے۔ مگر اللہ کو جاننے اور خالق کی تلاش میں وہ اتنے بڑے انسان قرار دیئے گئے، مقصدِ کائنات اور معرفتِ کائنات میں وہ اتنی بلند مرتبہ شخصیت قرار پائے کہ پروردگار عالم نے ارشاد فرمایا کہ:

قَالَ اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَاماً ○

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ ۲-۱۲۴)

ترجمہ:

"اے ابراہیم (خالق کی تلاش میں تیری اس جستجو، تیری اس تحقیق اور تیرے اس خلوص کے عوض) ہم نے تمھیں جملہ انسانوں کا امام بنا دیا۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

چونکہ علم کی بنیاد تدبر اور تفکر پہ ہی رکھی ہے اس لیے اللہ پاک اہل علم کے درجات کو بلند کرنے کی بات کرتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ وَفَوقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ○

القرآن الحکیم (سورۃ یوسف ۱۲-۷۶)

ترجمہ:

"ہم جس کے چاہیں درجات بلند کرتے ہیں اور ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے"۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

چنانچہ اس بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم محض اس امر کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں کہ بعض لوگوں کے ذہن میں جو یہ خلجان جگہ پا چکا ہے کہ مذہب اور سائنس میں مغائرت ہے یا مذہب سائنس کی راہ میں رکاوٹ ہے تو یہ محض ایک فکری مغالطہ ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔علوم کی دوسری ہزار ہا شاخوں کی طرح سائنس بھی علم کی ایک شاخ ہے۔اور علم کی کسی بھی شاخ کی انگلی پکڑ کر خالق تک پہنچنے کا سفر شروع کیا جا سکتا ہے اور سائنس تو دراصل اُن فطری قوانین پہ پڑے پردے کو چاک کرنے کا نام ہے جو انسان اپنے علم اور مشاہدے کی بنا حاصل کرتا ہے۔اس بات کو بنیاد بنا کر کچھ جاہلوں کا یہ کہنا کہ سائنس ہی خدا ہے اور سائنس کی اس قدر ترقی کے بعد اب کسی کی خدا کی گنجائش نہیں رہی تو یہ دوسری ہزاروں جاہلانہ باتوں کی طرح ہی ایک جاہلانہ بات ہے جس پر کسی سنجیدہ مکالمے کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔





سائنسی تحقیق کا کام جب مسلم اسپین سے نکل کر اٹلی فرانس اور برطانیہ پہنچا تو وہاں سائنس کے لیے ماحول ساز گار نہ تھا۔اس لیے جلد ہی مسیحی چرچ سائنس کی اس ترقی کی راہ میں حائل ہو گیا۔مسیحیت جب شام اور فلسطین سے نکل کر یورپ میں داخل ہوئی تو اس کا سامنا ارسطو کے افکار سے تھا جو بام مقبولیت پر تھے۔چرچ نے اپنی تاریخی روایات کو برقرار رکھا اور ارسطو کے افکار کا مقابلہ کرنے کی بجائے اس سے مفاہمت کی راہ اپنائی اور خود اپنے علم کلام کو افکارِ ارسطو کے مطابق ڈھال لیا۔حتیٰ کہ سو سال کے اندر ہی افکارِ ارسطو ان کے ہاں مقدس بن گئے۔مگر دو صدیاں مزید گذرنے پر جب سائنسی علوم کو کچھ ترقی حاصل ہوئی تو زمانے نے جانا کہ ارسطو کے افکار تو محض قیاسی اور بے بنیاد تھے ان کا حقیقت واقعہ سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔اب چرچ نے محسوس کیا کہ اگر سائنس کی اس نئی روشنی کا راستہ نہ روکا گیا تو خود ان کا سارا دین مشکوک ہو جائے گا۔اس لیے اس نے اپنی غلطی کو ماننے کے بجائے طاقت کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔اس زمانہ میں مسیحی چرچ کو یورپ

میں زبردست غلبہ اور اقتدار حاصل تھا۔ چنانچہ اس نے طاقت سے جدید سائنس کے نظریات کا راستہ روکنے کی کوشش کی اور بھیانک مظالم کا وہ سلسلہ شروع کیا جس کی زد میں بہت سے نابغہ روزگار شخص بھی آ گئے۔ مسیحی چرچ نے اول اول اہل علم وحرفت کے خلاف بے دینی کے فتوے جاری کیے مگر جب اس سے لوگوں کی زبانیں بند نہ ہوئیں تو پوپ کے خاص حکم سے احتساب کی خصوصی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مورخین بتاتے ہیں اس دور میں تین لاکھ آدمیوں کو مسیحی احتساب کی اس عدالت میں کھڑا ہونا پڑا۔ بہت سے لوگوں کو سخت اور بدترین سزاؤں سے گزارا گیا۔ تقریباً تیس ہزار صاحب علم افراد کو مسیحی چرچ کے حکم سے زندہ جلا دیا گیا۔ جن میں گلیلیو اور برونو جیسے قد آور سائنس دان بھی شامل تھے۔ اس کے نتیجے میں چرچ اور سائنس کے درمیان ایک جنگ چھڑ گئی جو بالآخر علم اور مذہب کی جنگ بن گئی۔

ارسطو کے مفروضہ مقدس عقائد پر بے جا اصرار کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ علم اور مذہب ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ایک کی ترقی دوسرے کی موت کا حکم رکھتی ہے۔ قرآن نے کہا کہ علم اللہ سے قریب کرنے والی چیز ہے مگر مسیحی تحریفات کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم لوگوں کو اللہ سے دور کرنے والا بن گیا۔ علم اور مذہب کا یہ تصادم دوسو برس سے زائد تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ علم کے ایک اور راہی (Sir Charles Darwan) نے چرچ کے جبر کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''Origin of Species'' شائع کی۔ یہ کتاب ۱۸۸۹ء کو منظر عام پر آئی جس نے علمی افق پہ ایک تہلکہ مچا دیا۔ مگر چرچ نے حسب توقع ایک طوفانِ بدتمیزی بپا کر دیا اور اس کتاب کی شدید مخالفت شروع کر دی۔ مگر اب چرچ کا زور قدرے ٹوٹ چکا تھا اور لوگ بہ سہولت نئے علمی نظریات قبول کر رہے تھے۔ چنانچہ علم اور مذہب کے مابین اس طویل معرکہ کو ختم کرنے کے لیے نئی راہیں کھوجنے کی کوشش کی گئی جنھیں بالآخر تلاش کر لیا گیا۔ اب علم اور مذہب یا یوں کہیے کہ سائنس اور مذہب کو جدا کر دیا گیا اور ان دونوں کے لیے الگ الگ دائرہ عمل متعین کر دیا گیا۔ چرچ اور اہل علم کے درمیان ہونے والے اس سمجھوتے کو سیکولرازم (Secularism) کا معروف نام دیا گیا جس کا اطلاق بعد میں ہر اس نظام فکر پہ کیا جانے لگا جو مذہب بیزار ہو۔ اس سیکولر تقسیم نے مذہب کو شخصی دائرے تک محدود کر دیا اور مسیحیت سے اجتماعیت کا خاتمہ ہو گیا۔

اس سمجھوتے کے تحت مذہب کو تو ایک دائرے میں مقید کر دیا گیا اور بقیہ تمام شعبوں میں انسانی آزادی کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا کہ وہ جو چاہے کرے۔ مگر علم چونکہ حدود وقیود سے آزاد ہے اس لیے اہل مغرب کے ہاں علم یعنی مادی سائنس دستیاب وسائل میں فراوانی کے باعث منزلوں پہ منزلیں مارتی رہی۔ مگر مذہب اور بھی سمٹ کر رہ

گیا کہ اس سیکولر سمجھوتے میں بھی ڈنڈی ماری گئی اور سائنس کو پھیلنے کے وسیع مواقع عطا کیے گئے جب کہ مذہب کو شخصی طبع کے رحم وکرم پہ چھوڑ دیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم اور مذہب کی یہ علیحدگی زندگی اور مذہب کی علیحدگی بن کے رہ گئی جس کا چرچ بھی بڑی حد تک ذمہ دار تھا کہ اس نے جن غیر آسمانی افکار ونظریات کو غلطی سے گلے لگا لیا تھا سائنس کی جدید روشنی میں بھی وہ ان کو اپنے مذہب سے خارج کرنے پر تیار نہ ہوا۔اس کا منطقی انجام یہ تھا کہ مذہب شخصی دائرے سے بھی نکل گیا۔آج کا امریکی یا برطانوی شہری اگرچہ خود کو مسیحی کہتا ہے مگر جب اس سے یہ سوال کیا جائے کہ مسیحیت کیا ہے تو اس کا مذہب ختم ہو جاتا ہے کہ عملاً وہ ایک سیکولر زندگی گذار رہا ہے۔ مذہب اس کے دائرہ ترجیحات میں دور دور تک کوئی مقام نہیں رکھتا۔جب چرچ نے اپنے مذہب سے ساری معنویت کھرچ ڈالی تو کوئی بھی سوچنے سمجھنے والی مخلوق اس کو اپنی زندگی کا لازمی جز کیوں کر بنائے گی۔یہی وجہ ہے مذہب اہل مغرب کے ہاں اب ایک رسمی ضمیمہ بن کے رہ گیا ہے جس نے انھیں اس احساس سے دوچار کیا جس کو آج کا مغربی دانشور بھی روحانی تشنگی قرار دے رہا ہے۔چنانچہ جسم و روح کی علیحدگی اور اس سے اگلے مرحلے میں خالق سے بے رخی کے نتیجہ میں تاریخ عالم میں پہلی بار انسانیت کے سامنے یہ مسئلہ پیش آیا کہ سامانِ حیات کی افراط کے درمیان بھی انسان احساسِ محرومی سے دوچار ہو سکتا ہے۔

آج انسان کی صورت میں ہمارے سامنے ایک ایسا وجود ہے جس کو اگرچہ سائنس اور مادیت نے سر سے لے کر پاؤں تک سامانِ تعیش سے لاد دیا ہے مگر سائنس اس کے چہرے پر حقیقی خوشی کا کوئی عکس مہیا نہ کر سکی جس کا اعتراف عہدِ حاضر کے سب سے بڑے فلسفی (Burtrand Russall) نے کچھ اس طرح کیا ہے۔ اس نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب (The Conquest of Happiness) کا آغاز ہی ان الفاظ سے کیا ہے:

> ”جانور اس وقت تک خوش رہتے ہیں جب تک ان کو خوراک ملتی رہے اور وہ صحت مند ہوں انسان کو بھی ایسے ہی ہونا چاہیے مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ آج کا پورا مغربی معاشرہ بظاہر صحت مند بھی ہے اور اسے خوراک کی فراوانی بھی ہے مگر اس کے باوجود وہ خوش نہیں۔شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جدید تہذیب نے اپنی عظیم کامیابیوں کے باوجود انسان کو اس کی طلب کا صرف ”نصف حصہ“ فراہم کیا ہے اس نے جسم کے تمام تقاضے تو فراہم کر دیئے مگر انسانی روح کے تقاضے کو نظر انداز کر گئی جس نے اس مہیب خلا کو جنم دیا جو آج کی یاسیت کہلایا اور

تشنگی کے نجانے کتنے روپ ہیں جن کو ہم پہچانتے تک نہیں مگر وہ اندر ہی اندر ہم کو احساس کے اس کنارے تک لے جاتے ہیں جہاں سکون اطمینان اور طمانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسان ازلی بے چینی کا شکار بن کے رہ جاتا ہے"۔



حقیقت یہ ہے انسان اپنی زندگی میں معنویت چاہتا ہے اس کے تقاضے جانوروں سے بہت مختلف ہیں کہ جانور کو جبلت عطا کی گئی مگر انسان کو عقل۔ عقل کے تقاضے جبلت سے بہت دور اور بہت سخت ہیں۔ انسان زندگی چاہتا ہے مگر جدید تہذیب اس کو انسان کی صورت اسٹیچو فراہم کرتی ہے۔ انسان قلب و دماغ کی تسکین چاہتا ہے مگر جدید تہذیب اس کو مشین کی بے روح گاڑی میں بٹھا کر چھوڑ دیتی ہے۔ انسان خالق کائنات سے ملنا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو مخلوق تک پہنچا کر اپنی سواری سے اتار دیتی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنے محسن کو سجدہ کرے مگر سائنس نے دنیا کی جو سیج سجائی ہے اس میں انسان کو کوئی اپنا محسن نظر ہی نہیں آتا۔ حتیٰ کہ اپنے اندر کی آواز سے مجبور ہو کر وہ مفروضہ خداؤں کے آگے جھکنے لگتا ہے مگر اسے سکون کی کوئی ساعت میسر نہیں آتی کہ قرآن نے پندرہ صدیاں قبل کہہ دیا تھا کہ اللہ کے سوا دوسرے تمام معبود محض اسماء ہیں نہ کہ حقیقتیں:

مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلاَّ أَسْمَاء سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَآؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّهِ أَمَرَ أَلاَّ تَعْبُدُواْ إِلاَّ إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَـكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لاَ يَعْلَمُونَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ یوسف ۱۲ ۔ ۴۰)

ترجمہ:

"اللہ کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ تو محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباؤاجداد نے رکھ لیے تھے مگر اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اتاری کہ فرمانروائی اور اقتدار صرف اس کے لیے ہے اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور یہی

سیدھا طریقہ ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے''۔



چنانچہ آج تک کے انسانی علوم نے اب اس امر کو مستحکم کر دیا ہے کہ انسان کے لیے ایک برتر خدا کی ضرورت اتنی مسلّم ہے کہ وہ مفکرین بھی اب اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے لگے ہیں جو اپنے ذوق کے مطابق خدا اور مذہب سے بے زار ہیں مثال کے طور پہ ''رسل'' کو ہی لے لیں جس نے اپنی آخری تحریروں میں لکھا ہے:

''اگر انسانی زندگی کو حقیقی معنوں میں زندگی بنانا ہے تو اس کے لیے کسی ایسے مقصد کا تعین از حد ضروری ہے جو خود انسانی زندگی سے باہر ہو، ایک ایسا مقصد جو غیر شخصی ہو عمومیت سے دور ہو اور انسانیت سے بلند تر ہو جیسے کہ ''خدا، یا صداقت یا حسن یا عشق''۔



یاد رہے کہ یہ ایک بہت بڑے منکر ''رسل'' کی زبان سے نکلے ہوئے وہ الفاظ ہیں جن میں اس نے خدا کی فطری ضرورت کا اقرار کیا ہے۔ دورِ جدید کے انسان کی محرومی یہ ہے کہ اس نے اپنے خدا کو کھو دیا ہے اور اب اس کی نجات صرف اس میں ہے کہ وہ دوبارہ اپنے خدا کو پا لے۔ علم الانسان کے ماہرین نے مختلف انسانی معاشروں کا مطالعہ کیا ہے اور کئی ہزار سال کے تاریخی ریکارڈ کو سامنے رکھتے ہوئے انسان کی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا متفقہ بیان ہے کہ انسان کی فطرت میں خدا کا تصور اس طرح پیوست (Interwoven) ہے جس طرح بکری سے گھاس اور شیر سے گوشت کھانے کی جبلت کو ختم نہیں کیا جا سکتا اسی طرح خدا کو انسانی فطرت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔



ہائے یہ اہل دانش

سترہویں اور اٹھارویں صدی کے یورپ میں روایت پسندی (Traditionalism) اور کلیسائی استبداد اپنے زوروں پہ تھا۔ اس دور کے تنگ نظر پادریوں نے قدیم یونانی فلسفے اور عیسائی معتقدات کے امتزاج سے بہت سے خودساختہ نظریات قائم کر رکھے تھے اور ان نظریات کے خلاف اٹھنے والی کسی بھی آواز کو وہ مذہب کے لیے خطرہ قرار دیتے تھے۔ شاہی نظام جبر کے ساتھ تنگ نظر پادریوں کے گٹھ جوڑ نے ایک ایسا استبدادی نظام قائم کر رکھا تھا جس میں کسی بھی آزاد اور علمی تحریک کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ معاشرے کی گھٹن کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ سقراط کو اپنے علمی نظریات کے تحفظ کے لیے آخر زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ چنانچہ اس نظام جبر کے خلاف جن نظریاتی تہذیبی سیاسی اور سماجی تحریکوں نے جنم لیا انھی کو بعد میں مادیت پسند کہا گیا اور جن کے افکار و نظریات کی بنیاد پر آج کے جدید مغرب کی بنیادیں استوار ہیں۔ ابتدائی مراحل میں یہ تحریکیں مذہب سے کلیتاً لاتعلقی کے تخیل سے خالی تھیں بلکہ ان کے پیش نظر محض اس استحصال کا خاتمہ تھا جو مذہب کے ٹھیکیداروں نے عام لوگوں کے ساتھ روا رکھا ہوا تھا۔ یہ لوگ قدامت اور روایت

پسندی کے خلاف تھے اس لیے لامحالہ ان کو جدیدیت کے علمبردار کہا گیا۔ جدیدیت کی ان تحریکوں کے جنم لینے میں کئی عوامل کارفرما رہے تھے جس میں سے ایک اسپین کی اسلامی تہذیب کے ساتھ طویل تعامل بھی تھا۔ جس کی وجہ سے عیسائی دنیا میں بھی اب حریت فکر کی آوازیں آنے لگیں تھیں۔ چنانچہ قرطبہ اور غرناطہ میں حاصل شدہ سائنس کے درس اب رنگ لا رہے تھے اور یورپ کے سائنس دان بھی آزادانہ تجربات کرنے لگے تھے اور مساوات کے اسلامی تصور کے اثرات نے جنوبی اٹلی سے لے کر سسلی تک انسان دوستی (Humanism) کی تحریکیں کھڑی کر دی تھیں۔ ان سب عوامل نے مل کر کلیسا کے جبر و استبداد کے خلاف ایک شدید ردِ عمل پیدا کر دیا تھا جس کے نتیجے میں جدیدیت کی حامی تحریکوں کو عوامی تائید حاصل ہوتی چلی گئی۔

چونکہ بیداری کی اس لہر سے قبل پورے یورپ میں شدید نوعیت کی دقیانوسیت اور روایت پرستی کا دور دورہ تھا اس لیے جدیدیت کی اس تحریک نے پورے عہدِ وسطیٰ کو تاریک دور قرار دے دیا تھا اور اس تاریکی سے نکلنے کی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ اصل میں جدیدیت کی اس تحریک کا حقیقی ہدف روایت پسندی اور مذہبی تنگ نظری کا خاتمہ تھا مگر ردِ عمل کی یہ لہر اتنی شدید تھی کہ اس نے جدیدیت کی اس تحریک کو اعتدال کی راہ سے ہٹا کر ایک دوسری انتہا پہ جا کھڑا کیا جہاں روایت پسندی اور عصبیت کے خلاف جدوجہد کرتے کرتے یہ تحریک مذہب کے بنیادی تصورات اور معتقدات سے ہی انکاری ہوگئی اور اسے ہر شخص کا ذاتی معاملہ قرار دے کے جان چھڑا لی۔ مذہب بیزاری کے اس رجحان کے پیچھے اس دور کے ان مفکرین کے افکار نے بنیادی کردار ادا کیا جو کسی خالق کے وجود سے انکاری تھے۔

چنانچہ جب راہزن کسی قوم کے راہبر بن جائیں تو معاشرے کی اخلاقی سماجی اور تہذیبی بنیادوں سے ابھرنے والا ہر عکس تقریباً وہی تصویر پیش کرے گا جس میں آج کے مغرب کا اصل چہرہ دیکھا جا سکتا ہے جس کی مادی ہوس نے کرہ ارض کا چہرہ لہولہان کر رکھا ہے۔ کلیسا کے جبر و استبداد کے خلاف جدوجہد کرنے اور معاشرے کو راہ اعتدال پہ ڈالنے کا دعوی کرنے والے وہ لوگ جنھوں نے اس تحریک کا آغاز کیا تھا پس پردہ چلے گئے۔ جدیدیت کی اس تحریک کو فرانسس بیکن (م ۱۶۲۶ء)، رینے ڈیکارٹ (م ۱۶۵۰ء) اور تھامس ہوبس (م ۱۶۷۹ء) جیسے ''بے دانش'' لوگوں نے اغوا کر لیا اور تمام اہل مغرب کو خالق کے وجود سے بے پرواہ کر دیا۔ انھوں نے اہل مغرب کو انسانی آزادی کے اس تصور سے آشنا کرایا جس میں فلاح کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نہ تھا، جس نے اہل مغرب کو روحانی طور پہ اس مہیب خلا میں جھونک دیا کہ آج اہل مغرب اپنے بچوں کو لفظ خوشی

کے حقیقی معنی سے آشنا کرانے کے لیے سکولوں میں علیحدہ کلاسز شروع کرنے پہ غور کر رہے ہیں۔ اگر آپ کو کبھی یورپ کے کسی اولڈ ہوم میں جانے کا اتفاق ہو تو وہاں بوڑھے اور بوسیدہ گوشت سے جنم لینے والی ایک مخصوص بو کا احساس ہوگا جو انتظامیہ کی تمام تر کوشش کے باوجود بھی ختم نہیں ہوتی تو شاید آپ کو روحانی تشنگی کے اس احساس تک پہنچنے میں آسانی ہو جو کسی بھی آزاد معاشرے کا خاصہ ہے۔ ان کی مادی کامیابیاں اپنی جگہ مگر خاندان کا بنیادی ادارہ ٹوٹنے کی وجہ سے جنم لینے والا خلفشار اتنا خوفناک ہے کہ خود اہلِ مغرب کا دانشور چیخ چیخ کر اپنے لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر زندگی کی جس رفتار کو انھوں نے اختیار کر لیا ہے اس میں کمی اب ان کے اختیار میں بھی نہیں۔ اب ان کے پاس پیچھے مڑ کے دیکھنے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ مادی معاشرے تیزی سے اس انتہا کی جانب سفر کر رہے ہیں جس کی دوسری طرف خیر کی کوئی بھی منزل ان کی منتظر نہیں، بلکہ اِک سراب ہے جس کے گہرے سائے میں زندگی کی خواہشات سے مبرّا اور روحانی تشنگی میں بلکتا بوسیدہ گوشت موت کی آرزو میں تڑپتا ہے مگر ریاست کے بے پناہ مادی وسائل اسے مرنے بھی نہیں دیتے۔

بات ہو رہی تھی سترہویں اٹھارویں صدی کے ان دانشوروں کی جن کے افکار نے مادی نظام فلسفہ کو وہ بنیادیں فراہم کیں جن کی وجہ سے اہلِ مغرب خالق کے وجود سے بے پرواہ ہو گئے۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اکثر مغربی معاشرے عیسائی ہیں جو کہ ایک الہامی مذہب ہے اس لیے وہ کسی خالق کے وجود سے کیسے انکاری ہو سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے کے انفرادی یا اجتماعی رویے ہی ان کے عقائد کا عکس ہوتے ہیں۔ اگر ہم دنیا میں بسنے والے ایک ارب ساٹھ کروڑ ملحدین (کیمونسٹ) کی زندگی کا طریق دیکھیں اور اس کا موازنہ مغرب کے تمام عیسائیوں سے کریں تو ان کے مابین مشترکات اتنے وسیع ہیں کہ یوں لگتا ہے دونوں کا تعلق ایک ہی قبیلہ سے ہے۔ اگرچہ دونوں کے طرزِ زیست میں عقیدے کا ایک بڑا فرق تو موجود ہے مگر عملاً اس فرق کو محسوس نہیں کیا جاتا اور ان کی سماجی اخلاقی اور معاشرتی اقدار باہم اس قدر پیوست ہیں کہ ان کو الگ الگ کرنا ایک دشوار کام محسوس ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے چرچ اتنے ویران ہوتے جا رہے ہے کہ ان کے پادری احساس تنہائی کا بوجھ اٹھائے دین مسیح کو ماننے والوں کے منتظر رہتے ہیں مگر امریکہ میں صرف دو فیصد لوگ ہفتے میں صرف پانچ منٹ ہی اپنے دین کے لیے نکال پاتے ہیں اور چرچ کی سروس کے دوران بھی ان کی نظریں اپنی گھڑیوں پہ ہوتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں تو یہودی اپنے عقائد میں زیادہ پختہ اور اپنے تصور دین کے بارے میں زیادہ جذباتی ہیں۔ چنانچہ فرانسس بیکن، رینے ڈیکارٹ اور

تھامس ہوبس جیسے مفکرین نے جدیدیت کی اس تحریک کو جونظریاتی بنیادیں فراہم کیں ان کی بنیاد ہی اللہ کے انکار پہ رکھی تھی اور وہ اپنے ان نظریات کو بغیر کسی شرم کے بیان کرتے ہیں۔ پھر اہل فلاسفہ کا پورا ایک گروہ پیدا ہوگیا جن کی دانش کی بنیاد ہی اللہ کے انکار پہ رکھی تھی مثلاً:

مذہب اس عقیدے کا نام ہے جس کے مطابق انسان اور کائنات کے مابین توافق پایا جاتا ہے۔
(میکٹے گارٹ)

****

اپنی تنہائیوں سے مفاہمت پیدا کرنے کا نام مذہب ہے۔
(وائیٹ ہیڈ)

****

مذہب اس خیال کا نام ہے کہ کائنات بامعنی ہے۔ (ویلس)

****

مذہب ان بندشوں اور رکاوٹوں کا نام ہے جو انسانی صلاحیتوں کو سلب کر لیتا ہے۔ (سالومن ریناخ)

****

مذہب کامل احتیاج اور انحصار کا نام ہے جو انسان کو بے عملی طرف مائل کرتا ہے۔ (مثائکر ماخر)

****

مذہب ان مافوق الطبع ہستیوں کی پوجا کا نام ہے جو انسان کے خیال میں اس کی زندگی پہ متصرف ہیں۔ (جے جی فریزر)

****

مذہب قدیم زمانے کے انسان کی دہشت کی تخلیق ہے۔ (لکریشس)

****

مذہب انسان کی تمناؤں کی تشنگی کا نام ہے۔ (سپنگر)

****

مذہب ایک پاگل پن کا نام ہے۔ (فرائیڈ)

****

مذہب برتر قوتوں کے متعلق اِک احساس کا نام ہے۔ (مارلے)

****

مذہب بے معنی عمل کو محکم اساس فراہم کرنے کا نام ہے (نامعلوم)

****

مذہب لوگوں کے لیے افیون کی طرح ہے۔ (کارل مارکس)

****

مذہب خوابوں اور تخیلات کی سرزمین ہے۔ (ای۔بی ٹائلر)

****

جب کائنات کی توجیح عقل اور مشاہدے سے کی جاسکتی ہے تو کسی خالق کی کیا ضرورت ہے۔
(رینے ڈیکارٹ)

****

مذہب ایک تخیلاتی اور بے نام سہارے کا نام ہے۔ (ڈیوڈ فارسمتھ)

****

کسی خالق کی کیا ضرورت ہے تم مجھے مادہ لا دو میں تمہیں یہ کائنات پھر سے بنادوں۔ (کانٹ)

****

اگر مجھے پانی اور دوسرے کیمیائی اجزا دستیاب ہوں تو میں خود انسان خلق کرسکتا ہوں۔ (ہیگل)

****

اب سائنس کا دور ہے اور خدا مر چکا ہے۔ (نطشے)

****

کائنات صرف مادہ اور اس کی حرکت کا نام ہے۔(ٹنڈل)

****

یہ ہیں ان مغربی اہل دانش کے وہ تصورات جن کو مادیت کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے جنھوں نے اہل مغرب کی زندگی میں وہ انقلاب بپا کیا جس نے انھیں محض نام کے عیسائی بنا دیا اور وہ دین مسیح کی اساسی تعلیمات سے اتنے دور جا نکلے کہ آج کہیں کھوجنے سے بھی ان پہ الہامی مذہب کے پیروکار ہونے کا شبہ نہیں ہوتا۔ تھامس ہوبس نے کہا کہ یہ دنیا اور کائنات عقل تجربے اور مشاہدے کے ذریعے قابل دریافت (Knowable) ہے۔ اس کے تمام حقائق تک سائنس کے ذریعے رسائی ممکن ہے تو پھر کائنات کی دریافت کے لیے کسی اور سرچشمہ کی طرف دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے خیال میں اس مذہبی تصور کی آج کی جدید دنیا میں اب کوئی گنجائش بھی نہیں اور صرف وہی حقائق قابل قدر ہیں جو عقل تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی پہ پورے اترتے ہوں۔ ان فلسفیوں نے تمام مذہبی تصورات اور مابعد الطبعیاتی مزعومات اور دعوؤں کو اس لیے رد کر دیا کہ وہ نہ تو ان کے مذکورہ معیار پہ پورے اترتے ہیں اور نہ ہی وہ ان کی سمجھ میں آتے ہیں۔

ڈیکارٹ نے اپنے فلسفے کی بنیاد اس پہ رکھی کہ "میں سوچتا ہوں اس لیے کہ میں ہوں" یعنی (I Think therefore I am)۔ ڈیکارٹ کے اس فلسفے نے نہ جانے کیوں اہل مغرب میں بہت مقبولیت حاصل کی اور انھوں نے اس نظریہ کو جدید مغربی فلسفے کی بنیاد قرار دے دیا۔ دوسرے لفظوں میں اس نے کہا کہ خودی کا شعوری عمل (Conscious Act of Ego) سچائی تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے۔ پھر خالق کے وجود کے ہر احساس سے عاری مفکرین کا پورا قافلہ اہل مغرب کو اس آزادی کا سبق پڑھانے لگا جو مادر پدر آزاد ہو اور جس کے دریچوں سے کسی مذہبی تصور کا گذر نہ ہو، پاسکل، مانسٹیکو ڈیڈارات، وسلی، ہیوم اور والٹیر جیسے کتنے ہی بے دانش "اہل دانش" نے عقل کی لامحدود بالا دستی اور واحد سرچشمہ علم ہونے کے تصور کو عام کیا۔ یہ افکار عقل پرستی (Rationalism) کہلائے اور انھوں نے جدیدیت کی نئی تعریف یوں کی کہ؛

"جدیدیت وہ روشن خیالی اور انسان دوستی ہے جو کسی بھی ہستی کی بالادستی اور روایت کو مسترد کرتی ہے اور صرف سائنسی اور عقلی علوم کو ہی تسلیم کرتی ہے۔ ہمارے نظریات عقل کی اس محکم بنیاد پہ کھڑے ہیں، جو سچائی کا واحد منبع خود مختار فرد کی عقل کو قرار دیتی ہے"۔



چنانچہ جدیدیت کی اس نئی تعریف نے اہل مغرب کے ہاں سے خالق کے ہر تصور کو نکال باہر کیا جس کی وجہ

سے ان کے ہاں مذہبی محاذ پر الحاد اور تشکیک نے جنم لیا۔ والٹئیر جیسے الحاد کے علمبرداروں نے مذہب اور کسی خالق کے وجود سے قطعی انکار کر دیا۔ تو ہیگل جیسے متشکک مذہب کو تسلیم تو کرتے ہیں مگر اسے عقل کے تابع بتاتے ہیں اور مذہبی حقائق کو بھی دیگر عقلی مفروضات کی طرح قابل تغیر قرار دیتے ہیں۔ سیاسی محاذ پہ ان افکار نے انسانی آزادی کے اس تصور کو اجاگر کیا جس نے اہل مغرب کو ہر اس اخلاقی معیار سے گرا کر رکھ دیا جو کسی انسانی معاشرے کے لیے معیار قرار دیا جا سکتا ہو۔ انھوں نے انسانی حقوق کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ تمام تر اخلاقی تصورات پس پشت ڈال دیئے گئے۔ تھامس ہابس نے انسانی حریت، اس کی آزادی فکر اور آزادی رائے کے احترام کے تصورات عام کیے۔ جان لاک نے عوام کو اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ قرار دیا، مانسٹیکو، روسو اور والٹئیر نے اس انسانی آزادی کا پرچار کیا جس کی حدود کے متعلق خود ان کے مابین بھی وسیع اختلافات تھے مگر ان سب کے افکار کی مشترکہ اساس ایک ایسے معاشرے کا قیام تھا جو کسی خالق کے وجود سے بے پرواہ ہو۔ حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ انھوں نے وہ معاشرہ قائم کر دکھایا جس کی وجوہات چاہے جو بھی ہوں سب سے بڑی وجہ جو مجھے نظر آتی ہے وہ ہے اخلاقی حدود و قیود سے آزادی جس نے ان کو جنس کی اس راہ پہ ڈال دیا جہاں انسان محض ایک جنسی حیوان بن کے رہ گیا۔





دور دور جہاں تک نظر جاتی ہے انسان گمراہی اور جاہلیت کی پناہ میں ہے۔ وہ ایسا مسافر معلوم ہوتا ہے جو صحرا میں رستہ بھول چکا ہو اور اب سراب اُسے منزل سے برگشتہ کرنے کے درپے ہوں۔ خطہ ارض پہ بسنے والے کئی ارب لوگ تو خدا کے وجود سے بھی انکاری ہیں۔ رہے وہ لوگ جو خدا کے وجود کے قائل ہیں تو اُن کی بھی بہت بڑی اکثریت خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتی ہے۔ زندگی کی مقصدیت قابل غور امر نہیں رہی، زندگی کی تعیش کے لیے زندگیاں اجیرن ہو کے رہ گئی ہیں۔ فکر و عمل کے بگاڑ نے انسانی معاشروں میں ہمہ پہلو اور ہمہ گیر جہالت کو جنم دیا ہے۔ مگر حیرت تو اس بات پہ ہے کہ لوگ اپنے اس سرمائے پہ نازاں ہیں۔ دنیا کے بہت سے معاشرے اخلاقی، عملی، فکری، معاشی، سماجی اور سیاسی بگاڑ کا شکار ہیں۔ تاریخی تناظر میں اس ہمہ گیر جاہلیت کا جائزہ لیں تو دو امور سرفہرست نظر آتے۔ اول اللہ تعالیٰ کی ذات سے انکار دوم اللہ تعالیٰ کے احکامات سے انکار۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اِس دور کے علماء نے اس تخیل کو علمی اور سائنسی دلائل فراہم کر دیئے ہیں جس سے جاہلیت کو علمی پشت پناہی بھی حاصل ہو گئی۔ بیان کیا جا چکا ہے کہ آج کا شر، آج کی جاہلیت آج کی گمراہی گزرے کل سے زیادہ شدید ہے۔ اس جاہلیت کا عظیم ترین فتنہ یہ ہے کہ اس کی تائید کے لیے بے پناہ علم اور لامحدود مادی وسائل موجود ہیں۔ آج باطل نے علم کا سہارا لے لیا ہے اور علم ہی کو گمراہی کا ذریعہ

بنا لیا ہے۔جدید نشریاتی نظام، ذرائع ابلاغ کے ادغام، نظریات کی ہمہ پہلو تشریحات اور خدا سے باغی اصحابِ دانش کی بے پناہ تاویلوں نے حق اور باطل کو باہم مدغم کر کے رکھ دیا ہے اور ایک قلب سلیم رکھنے والے شخص کے لیے حق تک پہنچنا دشوار بنا دیا گیا ہے۔آج صرف دولت ہی کی کثرت نہیں بلکہ مہلک اسلحہ کی بھی کثرت ہے۔یاد رہے کہ انسانی معاشرے خواہ کتنے ہی فساد کا شکار کیوں نہ ہو جائیں لیکن اِن میں تمام کا تمام شر غالب نہیں ہو سکتا کہ خیر کا نام ونشان ہی مٹ جائے۔اگرچہ انفرادی طور پر ایسا ہونا ممکن ہے کہ کوئی شخص نفس کی قید میں اس قدر ملوث ہو جائے کہ وہ سراپا شر بن کے رہ جائے اور اس سے خیر کی توقع بھی باقی نہ رہے۔

تاہم کوئی معاشرہ پورے کا پورا شر کا شکار نہیں ہوتا اور اسی لیے اہل مغرب کی شدید جہالت کے باوجود اُن کو کچھ تہذیبی اور مادی سہولتیں مہیا ہو گئیں ہیں جو اپنی ظاہری شکل میں بہت پر کشش دکھائی دیتی ہیں۔اُن کو بعض پہلوؤں میں دیگر اقوام سے برتری حاصل ہو گئی ہے یعنی طب، عسکریات، معاشیات کے میدانوں میں وہ دوسرے لوگوں سے آگے ہیں مگر یہ برتری انھیں اللہ سے انکار کی قیمت پر حاصل ہوئی ہے اور یہ بہت بڑی قیمت ہے اگر کوئی جانے تو؟؟؟

یورپ میں جب صنعتی انقلاب آیا تو اُن کے صاحب علم نے اُن کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ صنعتی پیداوار نہیں کرتا بلکہ انسان کرتا ہے۔چونکہ انسان نے اپنے علم کی بنا پر مادے کے خواص معلوم کیے ہیں اور خود ہی وہ مشینیں بنائی ہیں جن سے وہ صنعتی پیداوار حاصل کرتا ہے انسان ہی مشین کو حرکت دیتا ہے اور انسان ہی کے اشارے پر مشین رُک جاتی ہے۔انسان ہی خام مال کو تلاش کرتا ہے اور وہی خام مال سے پیداواری مصنوعات حاصل کرتا ہے اور جب یہ سارے کام انسان خود ہی کرتا ہے تو وہ خدا کی بجائے صنعت کی پرستش کیوں نہ کرے۔چنانچہ لوگوں کی اکثریت جو پہلے کلیسا اور جاگیر دار کی غلامی میں تھی اب وہ صنعت اور صنعت کار کی غلامی میں آ گئی۔رفتہ رفتہ کلیسا کا اثر کم ہوتا گیا اور لوگ محض مادیت کے پجاری بن کے رہ گئے اس سے اگلے مرحلے میں جب انھیں مادی آسائش حاصل ہو گئی تب وہ نفس کے پجاری بن کے رہ گئے۔روحانیت کم ہوتی چلی گئی اور مادیت اُن کا واحد معبود بن کے رہ گئی۔جب وہ روحانیت سے یکسر عاری ہوئے تو انھوں نے طبیعت (Nature) کے دامن میں پناہ لی۔رفتہ رفتہ طبیعت نے اللہ کی جگہ لے لی۔یہ دراصل فلسفے کا الجھاوا تھا جس میں لوگوں کو اس لیے دلکشی نظر آئی کہ وہ کلیسا کے جبر سے اکتائے ہوئے تھے۔کلیسا نے اُن پہ اس قدر تاوان مقرر کر رکھا تھا جسے ادا کرنا اُن کے لیے نہایت دشوار تھا۔چنانچہ جب اُن کو فرار کے لیے کوئی

سوراخ نظر آیا تو وہ تیزی سے اس کی طرف لپکے۔اس لیے بھی کہ طبیعت کے نام پر جو نیا الٰہ تراشا گیا تھا اس کا نہ کوئی کلیسا تھا اور نہ ہی اس کے حقوق وفرائض تھے اور ساتھ ہی یہ لوگوں کے جذبہ عبودیت کی تسکین بھی کرتا تھا۔وہ ہر حال میں کلیسا کے اُس جبر سے جان چھڑانا چاہتے تھے جو کئی صدیوں سے اُن پہ مسلط تھا اور وہ اُس کی روحانی برکات سے بھی مایوسی کا شکار ہو چکے تھے۔یہ یورپ کا درمیانی دور تھا جب طبیعت کے دیوتا کی پوجا ہو رہی تھی۔اس زمانے کے لوگوں کے دلوں میں اللہ کا تصور موجود تھا جسے وہ اپنی خلوت میں پکارتے تھے۔کلیسا میں بھی اللہ ہی کی عبادت ہوتی تھی اور وہ کسی حد تک اپنے مذہب اور اخلاقی روایات کے بھی پابند تھے۔تاہم یہ سب کچھ بطور عادت کے تھا عبادت کے نہ تھا اور نہ ہی اس کے پس پشت کوئی ایمانی قوت تھی۔اسی طرح اُن کے ہاں الٰہ کا تصور ماند پڑتا رہا بلکہ چند در چند ہوتا رہا۔اُن کے درمیان پیچیدگیاں بڑھتی رہیں، چنانچہ اُن کے ہاں جب کلیسا میں نماز پڑھی جاتی تو اللہ کی ذات کو محبوب سمجھا جاتا اور اسی سے ڈرا جاتا۔تاہم جب فنی شعور کا معاملہ ہوتا تو طبیعت سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی۔کیونکہ تحریک رومانویت نے اُن کے ہاں طبیعت (Natureizm) کو بڑی اہمیت دے دی تھی اور اُن کے شعرانے اس کا عمدہ منظر باندھا تھا۔

علاوہ ازیں اُن کے ہاں علمی ترقیات میں بھی طبیعت ہی کو مرکزی مقام حاصل ہو رہا تھا۔اس لیے کہ تب سائنس دانوں نے وہ قوانین طبیعت معلوم کر لیے تھے جن کی بنا پہ کائنات کی علمی توجیح ممکن ہوئی۔چنانچہ تب کلیسا کی شکست کی بنا پڑ گئی تھی اس لیے کہ وہ اِن علمی حقائق کو مسترد کرنے کے قابل ہرگز نہ تھے۔جبکہ سو سال قبل ہی وہ کسی نئی علمی توجیح کے عالم کو قتل کر دینے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔مگر اب معاشرے پہ کلیسا کی گرفت اس قدر مہیب نہ تھی کہ وہ نئے اور ابھرتے ہوئے علمی نظریات کو رد کر سکے۔چنانچہ تب عوام تین الٰہاوں میں منقسم ہو گئی اور طبیعت اُن کا تیسرا الٰہ قرار پایا جب کہ قرون وسطیٰ میں اُن کے دو ہی الٰہ تھے کلیسا یعنی کہ عقیدہ اور قانون یعنی کہ بادشاہ۔مگر اب طبیعت (Nature) اُن کا تیسرا خدا تھا۔تغیر کا عمل جاری رہا اور یورپ میں صنعتی دور کا آغاز ہونے لگا تھا تب طبیعت کی ساحری رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اس لیے کہ الوہیت رفتہ رفتہ اُن میں دم توڑ رہی تھی۔دوسری طرف فنی نقطہ نگاہ سے بھی طبیعت مرکز خیال نہ رہی تھی بلکہ عملی زندگی میں اب انسان کسی بھی الٰہ کو پوجنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا اس لیے کہ صنعتی زندگی نے جہاں اُس کے شب وروز بدلے تھے وہیں علمی نقطہ نگاہ سے انسان نے طبیعت کے رازوں کا پردہ بھی چاک کر دیا تھا اور خود طبیعت پر اُس کی بالادستی قائم ہو چکی تھی۔چنانچہ مغرب کے ہاں الوہیت اللہ سے طبیعت میں منتقل ہوئی اور طبیعت سے

رومانویت میں اور رومانویت کے بعد صنعتی تسلسل نے انسان کو کسی بھی خدا سے بے نیاز کر دیا۔اہل سائنس اور جدیدیت کے علمبردار علماء نے بھی لوگوں کے اس تخیل کی پشت پناہی کی اور لوگوں کو اس امر کی طرف مائل کیا کہ کسی غیبی طاقت کسی اَن دیکھی قوت کے سامنے سر جھکانا انسان کے لیے عزت کی بجائے ذلت کی بات ہے۔اور انسانیت کے لیے ہرگز مناسب نہیں کہ وہ اپنے افکار اور اپنے اخلاق کا مرجع کسی ایسی ہستی کو بنائے جسے نہ وہ دیکھ سکتا ہے اور نہ محسوس کر سکتا ہے۔بھلا کب تک انسان اندھا بن کر اِن بے حقیقت اساطیری قوانین پر چلتا رہے؟

چنانچہ انسان مذہب کی گرفت یا دوسرے لفظوں میں کلیسا کی گرفت سے آزاد ہوتا چلا گیا اور یہ اس کے دل کی خواہش بھی تھی۔اُس نے اُن معبودوں کی پرستش بھی چھوڑ دی جن کی پرستش وہ جاہلیت یعنی مذہب کے عہد میں کرتا تھا۔تب اصول عبادت اور اللہ تعالیٰ پہ ایمان لانے کو دقیانوسی قرار دے دیا گیا،عقلیت پسند جیت گئے اور اب ہر چیز کو چاہے وہ عقیدہ ہو یا روحانیت عقل کی کسوٹی پہ پرکھا جانے لگا۔جو بات عقل کی گرفت نہ آئے اُسے افسانہ قرار دے دیا گیا اور خدا کے وجود کا عقل کیا سراغ لگاتی؟ چنانچہ خدا کا وجود بھی اُن کے گزرے کل کی طرح اُن کی عملی اور اعتقادی زندگی سے تحلیل ہو گیا۔اس لیے انسان نے خود ہی اپنی زندگی کی تعمیر شروع کر دی اور قانون سازی کا حق بھی خالق سے خود انسان ہی کو منتقل ہو گیا۔اُس دور کے علماء کا خیال تھا کہ چونکہ انسان لحظہ بہ لحظہ اپنی بدلتی ہوئی ضروریات سے خالق سے بھی زیادہ آگاہ ہے اس لیے اُسے خود ہی اپنے لیے قانون بنانا چاہیے۔جب اس بگاڑ میں مزید اضافہ ہوا تو وہ اپنے ساتھ انسان کی عبادت کو بھی بہا کے لے گیا۔

بگاڑ کو اس نہج تک لے جانے میں رومی اور یونانی فکر کا بہت عمل دخل تھا۔یونانی فکر و فلسفہ میں خالق کا قد بہت نیچا ہے اور عقل کی پہنچ بہت بڑھی ہوئی ہے۔چنانچہ یونانیوں کا الٰہ انسانوں ہی کی طرح کا رویہ اختیار کرتا ہے اور انسانوں سے جنگ بھی کرتا ہے جس میں بیشتر اوقات عقل کے ذریعے انسان ہی غالب رہا ہے۔چنانچہ رومی الہامیاب میں انسان اور خدا کے مابین نفرت کی خلیج حائل ہے اور لوگ اپنے معبود سے محبت کی بجائے نفرت کرتے ہیں اور اُس پہ غلبہ حاصل کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔رومی جاہلیت کا یہ قدیمی خیال کہ جو کچھ حواس خمسہ کے ذریعے محسوس ہو سکے وہی حقیقت ہے باقی سب فسانہ ہے۔چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو حواس خمسہ کے ذریعے سے محسوس نہیں کیا جا سکتا اس لیے خدا پہ ایمان لانا بھی ضروری نہیں ہے۔چنانچہ رومی جاہلیت نے عقل کو بڑھاوا دیا اور انسانی عقل کو اس قدر بلند کر دیا کہ وہ بلا تکلف خالق کے معاملات میں بھی

دخیل ہو سکتی ہے۔ اہل مغرب نے عقل کو اس حد تک چھوٹ دے دی کہ وہ خالق کے وجود پر بھی تنقید کرنے لگے جس سے اہل مذہب اور عقلیت پسندوں میں ایک کشمکش وجود میں آ گئی۔ نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی دور میں تو یہ کشمکش کھلم کھلا جاری تھی کہ جاہل اور کمزور آدمی تو خدا کے سامنے جھکتا تھا مگر جب وہ علم و طاقت حاصل کر لیتا تو اُس کا رتبہ اور مقام خدا سے بھی بڑھ جاتا۔ چنانچہ جوں جوں اہل عقل میں اضافہ ہوتا رہا اور وہ علمی انکشافات سے لوگوں کو مسحور کرتے رہے تب تب خدا کے وجود کی دلیل کم سے کم ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ انسان کسی خالق کی ضرورت سے بے نیاز ہو گیا۔ عقل نے انسان کو ہی انسان کا معبود بنا دیا تب انسان اور انسان کے مابین ایک کشمکش شروع ہو گئی کہ ایک طرف انسان عابد تھا جو کسی معبود کے وجود کی ضرورت محسوس کرتا تھا تو دوسری طرف انسان معبود تھا جس کو اپنی عقل پہ ناز تھا اور وہ اپنی عقل کی شکست تسلیم کرنے کو کسی طور تیار نہ تھا۔ پھر یہ کشمکش پھیل گئی، فرد کی جماعت کے ساتھ، فرد کی معاشرے کے ساتھ، فرد کی اقدار کے ساتھ اور پھر فرد کی دوسرے فرد کے ساتھ کشمکش بپا ہو گئی اور اس روحانی انارکی نے انسان کی عبادت کا خاتمہ کر دیا اُسے خالق کے وجود سے دور کر دیا۔

اُس معاشرے میں معبودوں کی تعداد بڑھتی رہی پوجا کے لیے نہیں بلکہ عقل کی تسکین اور فتح کے لیے۔ چنانچہ علمی مباحث سے کئی مزید معبود نمودار ہوئے اور انسان اقتصادی، اجتماعی اور تاریخی جبریتوں کو حاکم تسلیم کرتا چلا گیا۔ اس سارے فساد اور شر کی طویل داستان کے آخر میں انسان نے مادیت کے سامنے شکست تسلیم کر لی اور وہ مذہب سے بہت دور ہٹ گیا۔ اول اول اُس نے صرف تقدیر سے انکار کیا۔ تقدیر پہ انسان کی بالادستی کا قائل ہوا اس کے بعد وہ صنعتی عہد میں داخل ہوا جس کے آخر میں وہ مادہ پرستی کا اسیر ہو کے رہ گیا۔ یہ وہ شر ہے جس نے آج کی دنیا میں بیشتر آبادیوں کو لپیٹ میں لے لیا ہے اور دور دور تک مادیت پرستوں کا راج نظر آتا ہے۔ مادیت کے اس دستور نے انسانیت کو بھیانک نتائج تک پہنچایا۔ مادی زندگی میں نتائج کا طریقہ کار ہی زندگی کی اجتماعی، سیاسی اور معنوی شکلیں متعین کرتا ہے۔ انسانی شعور کو متعین نہیں کرتا بلکہ یہ شکلیں انسانی شعور کا رخ متعین کرتی ہیں۔ جبریتوں کا دیوتا مادیت انسان کے فکر و تخیل اور اُن کے حق و انصاف کی طرف سبقت کی فطری صلاحیت کا خیال کیے بغیر اُن کی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ یہ ایسا دیوتا ہے جو انسانوں کے ضمیر کی آواز پر لبیک نہیں کہتا اور نہ اُن کے نفس کے ساتھ چلتا ہے۔ جیسا کہ اللہ انسان کے ضمیر کی آواز کو سنتا ہے اور نفس انسانی کی رعایت کرتا ہے۔ خالق انسان پر بے جا بوجھ نہیں ڈالتا مگر مادی جبریت انسان کو کشمکش اور مسابقت کی وحشت کے حوالے کر دیتی ہے۔ مادہ پرست معاشروں میں اخلاقی اور عقائدی تنزلی

کے پس منظر میں خواہش کی نہ ختم ہونے والی اشتہا ہے جس نے لوگوں کے انبوہ کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ یاد رہے کہ اس سارے تنزل کے پس منظر میں نہ تو کوئی عقلی منطق ہے اور نہ کوئی بصیرت، نہ ہی کوئی سند، کیونکہ جب اللہ کے ساتھ شرک کے بگاڑ کی ابتداء ہوئی تو اُس کے لیے بھی لوگوں کے پاس نہ تو کوئی منطقی استدلال تھا نہ کوئی بصیرت نہ کوئی تائید۔ اس لیے جو شخص یا جو معاشرہ اللہ کی حقیقت سے واقف ہو وہ کبھی شرک کی راہ پہ نہیں چلتا۔ بیان کیا گیا ہے کہ جب یورپ میں نصرانیت داخل ہوئی تو کانسٹائن کے ہاتھوں اُس میں رومی ثنویت کی آمیزش ہو چکی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ نے اللہ کی حقیقت کو کبھی سمجھا ہی نہیں۔ چنانچہ اُن کی جاہلیت میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا رہا۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کردہ شریعت چونکہ رومی سلطنت کے مختصر حصے میں ظہور پذیر ہوئی تھی اس لیے اتنی وسیع سلطنت میں اس کا نفاذ ممکن نہ ہو سکا۔ یہ حقیقت ایک عذر سے پردہ تو اٹھاتی ہے لیکن یہاں اس حقیقت سے غفلت برتی گئی کہ مسیحی تصور میں عقیدہ خود بھی صحیح نہ تھا اس لیے کہ اگر عقیدہ صحیح ہوتا تو رومی سلطنت اُس کا راستہ نہ روک سکتی جیسا کہ اسلام کا عقیدہ درست تھا اس لیے اسلام کے سامنے نہ عرب کی اندرونی طاقتیں زیادہ دیر تک ٹھہر سکیں اور نہ بیرونی طاقتیں اسلام کا راستہ روک سکیں۔ جب کہ بیرونی طاقتوں میں خود روم اور ایران کی عظیم الشان مملکتیں بھی شامل تھیں۔ بہر حال یہ ایسے اسباب ہیں کہ ان سے واقعات کی تشریح تو کی جاسکتی ہے مگر اِن سے راہِ حق سے انحراف کا جواز فراہم نہیں کیا جاسکتا۔ اصل میں مسیحیت کے عقیدے میں پیدا کردہ تحریف ہی اصل بگاڑ کا باعث بنی۔ چنانچہ اُن کے نفس نے شرک کی غلاظت کو قبول کر لیا تو اس کے بعد تمام تر اخلاقی تنزل اُن کے لیے آسان ہو گیا۔ یورپ میں دین کی ابتداء ہی غلط ہوئی اس لیے اہل یورپ رفتہ رفتہ خدا سے دور ہی ہوتے رہے اور آج اُن کی خالق سے دوری اپنی انتہا کو چھو رہی ہے۔ جب کلیسا نے اپنی حماقتوں سے برائیوں اور خرابیوں میں اضافہ کر دیا تو یہ اہل یورپ کے عقیدے میں مزید بگاڑ کا باعث بنا۔ جس نے بتدریج اس بگاڑ کو بیسویں صدی کے عظیم شر سے جا ملایا۔ جس نے لوگوں سے اُن کے خدا کو چھین لیا اور اُس کے دل میں آرزوؤں اور خواہشوں کا ایسا الاؤ جلا دیا جس کو بجھانے میں ہی اُن کی عمر گزر جاتی ہے اور وہ خیر کی تلاش کی مائل ہی نہیں ہوتے کہ اُن کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ جان سکیں کہ خیر کیا ہے شر کیا ہے؟؟؟





مذہب انسانی زندگی کا ایک تصور اور اس تصور کی بنا پر بننے والے اس ہمہ گیر طرزِ عمل کا نام ہے اور جو انسان سے اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے کچھ مطالبات اور تقاضے کرتا ہے اور سائنس اس ''محسوس'' دنیا کے مطالعے کا نام ہے جو ہمارے مشاہدے اور تجربے میں آتی ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ حقیقت میں مذہب اور سائنس کے درمیان کوئی تصادم نہیں اس لیے کہ مذہب فطرت ہے اور سائنس مطالعہ فطرت تو اس میں اختلاف کیسا۔ مگر اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ مذہب اور سائنس کے مابین اس مفروضہ تصادم کی ایک فضاء موجود رہی ہے اور کوئی نہ کوئی بنیاد ایسی ہے جس کی بازگشت گاہے بگاہے سنائی دیتی رہتی ہے۔

سائنس اور مذہب کا روائتی ٹکراؤ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں شروع ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب جدید سائنس کی بنیاد پڑی اور اس بنیاد پر بعض اہل فکر نے دعویٰ کیا کہ سائنس کی دریافتوں نے مذہب کو جڑ سے اکھاڑ دیا ہے۔ اس فکر نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اب خدا کو ماننے کی کوئی وجہ نہیں کہ خدا کو ماننے کی ایک بہت بڑی

وجہ یہ تھی کہ تصورِ خدا کے بغیر کائنات کی توجیہ ممکن نہ تھی اور اب چونکہ جدید سائنس کی روشنی میں انسان مظاہرِ کائنات کی تشریح کر سکتا ہے اس لیے انسان کے لیے اب ضروری نہیں رہا کہ کسی خدا کے دامن سے ہی وابستہ رہے۔اس طرح خدا کا خیال ان کی نظر میں ایک بے ضرورت چیز بن گیا اور جو خیال بے ضرورت ہو جائے اس کا بے بنیاد ہونا بھی لازمی ہے۔مگر حقیقت کچھ اور ہے کہ جب یہ دعویٰ کیا گیا تھا اگرچہ اس وقت بھی اس کی کوئی علمی حیثیت نہ تھی مگر سائنس کی ترقی کے ساتھ اس دعویٰ کی لغویت خود ہی ثابت ہوگئی اور آج کی جدید سائنس خود براہ راست یا بالواسطہ اس بات کا اعتراف کر رہی ہے کہ اس کے پاس تصورِ خدا کی نفی کے لیے نہ تو کل تسلی بخش علمی دلائل موجود تھے اور نہ ہی آج کسی بنا پر کوئی حتمی فیصلہ صادر کیا جا سکتا ہے۔یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر سائنس کی وہ کون سی خاص دریافت تھی جس کے بعد انسان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اب مزید اسے خدا کی ضرورت نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سائنس کی وہ خاص کامیابی یہ تھی کہ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ کائنات کچھ خاص قوانینِ فطرت کی تابع ہے۔قدیم زمانے میں انسان سادہ طور پر صرف اتنا جانتا تھا کہ اس کی دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کے پیچھے کوئی طاقتور ہستی کارفرما ہے۔اگرچہ اس طاقتور ہستی کا تصور انسانی ارتقاء کے ساتھ اپنی صورتیں بدلتا رہا۔مگر یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ انسان نے ہر دور میں اس طاقتور ہستی کو پوجا ہے اور تمام مظاہر کائنات کو اس کے دستِ قدرت کی چابکدستی قرار دیا ہے۔مگر شعوری ارتقاء کے بعد جب انسان نے سائنس کے میدان میں قدم رکھا تو اس نے جانا کہ اس کے اردگرد وقوع پذیر ہونے والے ہر واقعے کے پیچھے کوئی نہ کوئی سبب چھپا بیٹھا ہے جس کو سائنس کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے، تجربے اور مشاہدے کے ذریعے ہر سبب کے مسبب تک رسائی ممکن ہے۔جیسا کہ نیوٹن کے مشاہدے نے اس پہ آگہی کے جو در وا کیے ان میں جھانک کر اس نے معلوم کر لیا کہ آسمان کے تمام ستارے اور سیارے کچھ ناقابل تغیر قوانین میں بندھے ہوئے ہیں اور انھی کے تحت حرکت کرتے ہیں۔

ڈارون نے کتابِ فطرت کے اوراق الٹے تو اس نے جانا کہ انسان کسی خاص تخلیقی منصوبے کے تحت وجود میں نہیں آیا بلکہ ابتدائی زمانے کے کیڑے مکوڑے عام مادی قوانین کے تحت ترقی کرتے کرتے انسان کی صورت میں ڈھل گئے۔اسی طرح کئی دوسرے مفکرین نے یہ خیال پیش کیا کہ مطالعہ اور تجربہ بتاتا ہے کہ آسمان سے لے کر زمین تک پیش آنے والے سارے واقعات ایک معلوم نظام کے تحت ظاہر ہوتے نظر آتے

ہیں جس کو قانونِ فطرت یا ''Law of Nature'' کہا جاتا ہے قانون فطرت کا یہ عمل اس درجہ منظّم تھا کہ آنے والے وقت میں پیش آنے والے واقعات کی درست پیش گوئی ممکن ہوگئی تھی۔ چنانچہ قانونِ فطرت کی باریکیاں جاننے کے بعد انسان نے یہ خیال کیا کہ ماضی میں جن واقعات کو وہ خدا سے منسوب کرتا رہا ہے وہ دراصل کچھ مادی اور طبعیاتی قوانین کی کارفرمائیاں تھیں۔ اب اس نے پختہ طور پہ اس بات کا یقین کرلیا کہ کائنات کی ساری حرکتیں اور اس کے تمام مظاہر خواہ وہ ذی روح اشیا سے متعلق ہوں یا بے روح اشیا کے بارے میں ہوں ایک اندھے مادی عمل کے سوا کچھ نہیں۔ سائنس نے جس دنیا کو دریافت کیا اس میں کہیں خدا کی کارفرمائی نظر نہیں آتی جو تمام مذاہب کی بنیاد ہے۔ اس لیے اس دور کے فلاسفہ نے تکبر کی روش کو اپنایا اور نظم کائنات میں کسی خالق کے وجود کو خارج از امکان قرار دے دیا۔ اگرچہ ان دریافتوں کے حصول کے وقت اس کھیل کے تمام نامور کھلاڑی خدا کے ماننے والے تھے مگر پھر یہ ہوا کہ جب کائنات کے تمام واقعات کی توجیہ خود مادی دنیا کے اندر موجود اسباب وقوانین سے ممکن ہونے لگی تب انھیں کسی خدا کا وجود قطعاً غیر ضروری معلوم ہوا۔ پھر وہ اپنے اس خیال میں پختہ ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ ان کا علم ان کو اندھیری راہوں کی طرف دھکیلتا رہا۔ انھوں نے کہا کہ جب تک دوربین نہیں بنی تھی اور علم ریاضیات میں انسان نے ترقی نہیں کی تھی تو اس وقت کا انسان نہیں جانتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا ہے اور کیسے ڈوبتا ہے۔

چنانچہ اس نے یہ فرض کرلیا تھا کہ کوئی خدائی طاقت ہے جو اس کے لیے دن اور رات کا سماں پیدا کررہی ہے مگر اب فلکیات کے علم نے وہ حجاب اٹھادیئے ہیں اور انسان جانتا ہے کہ جذب وکشش کا ایک عالمی نظام ہے جس کے تحت سورج، چاند، ستارے سیارے اور زمین حرکت کررہی ہیں۔ یہ دن اور رات اسی حرکت کا منطقی نتیجہ ہیں اور اسی طرح وہ تمام چیزیں بھی ہیں جن کے بارے میں پہلے زمانوں میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی ماورائی طاقت ہے۔ جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردعمل کا نتیجہ نظر آئیں۔ گویا واقعہ کے فطری سبب کو جان لینے کے بعد وہ ضرورت آپ سے آپ ختم ہوگئی جس کے لیے پچھلے لوگوں نے ایک خدا یا کسی مافوق الفطری ہستی یا قوت کا تصور اپنایا ہوا تھا۔ (Haskelly) کہتا ہے کہ اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کا انعطاف (Refraction) ہے تو پھر وہ قدیمی تصور کہ یہ آسمان پہ خدا کا نشان ہے کیسے قابل قبول رہ جاتا ہے۔ یعنی واقعات اگر فطری سبب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو پھر وہ کسی مافوق الفطری قوت کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہوسکتے اور ظاہر ہے کہ جب واقعات کے پیچھے مافوق الفطری اسباب موجود نہ ہوں تو کسی مافوق الفطرت ہستی کے وجود پر کیسے یقین کیا جا

سکتا ہے۔ یہ اور کچھ اسی قسم کی اور دلیلیں اس صاحب عقل قافلے کا اثاثہ تھیں جنہوں نے ابتدا میں انسان کے لیے اس کے خالق کے وجود کو غیر ضروری قرار دیا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قدر بودی توجیحات کو مدنظر رکھتے ہوئے جن لوگوں نے خالق کے وجود سے انکار کیا وہ بڑے ہی بد دماغ لوگ تھے۔

کیونکہ خالق کو کھوجنے کے لیے کائنات کی وسعتوں میں جانے کی ضرورت ہی نہ تھی وہ تو خود انسان کی ذات کے اندر ڈیرے جمائے بیٹھا ہے۔ اگر انسان اپنی ذات کے ان دریچوں میں ذرا دیر کے لیے جھانکنے کا تردد کر لیتا تو اس کے اندر تکبر کی یہ روش اپنانے کی کبھی جرأت ہی پیدا نہ ہوتی کہ خالق کے وجود کی دلیلوں کو بیان کرنے کے لیے اگر زمین کے تمام درخت قلم بنا دیئے جائیں اور تمام سمندر سیاہی میں بدل جائیں تب بھی نہ خالق کی باتیں ختم ہوں گی اور نہ اس کی صفات۔ خود انسان کا وجود اس کا دل اور اس میں موجزن جذبات ہر آن اس سے کسی در پہ جھک جانے کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ جب وہ رحم مادر میں تھا تب خالق کے احسان نے اس پہ تخلیق کے وہ تمام مراحل آسان کیے ورنہ انسان کی اوقات ہی کیا ہے اچھلتے ہوئے پانی کے چند قطرے جن کو عقل سے نوازا گیا تو وہ خود اپنے خالق کے گریبان کی طرف بڑھا۔ ایک مغربی عیسائی دانشور نے کیا خوب بات کہی تھی۔

Nature does not explain

She is Her self in need of an Explanation

کہ فطرت کائنات کی توجیہ نہیں کرتی بلکہ وہ تو خود اپنے لیے ایک توجیہ کی طالب ہے

اور

Nature is a fact Not an Explanation

(یعنی فطرت کا قانون تو کائنات کا ایک واقعہ ہے اس کو کائنات کی توجیہ قرار نہیں دیا جا سکتا)



دراصل مخالفین مذہب جس انکشاف کو فطرت کی توجیح کا نام دے رہے ہیں اور اس کو خدائی نظام کا بدل قرار دے کر اس کی ذات سے انکار پر مائل ہیں وہ تو خدا کے ان قوانین کے مطیع ہے جس کے ذریعے خالق اپنی کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے جو ان ذہنوں نے پھیلائی ہے جو مذہب کی لگائی ہوئی اخلاقی

پابندیوں سے چڑتے تھے اور ان کو اپنی ذات کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ محسوس ہوتی تھیں وہ مادر پدر آزاد زندگی گذارنا چاہتے تھے اور اس میں کسی اخلاقی قدر کو دخیل نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ دراصل وہ اپنے نفس کے ایسے بندے تھے جن کا وجود ہر دور میں موجود رہا ہے مگر ان کی آواز کبھی بھی حق کی آواز پہ غالب نہیں ہوئی۔

بد قسمتی سے ملحد پسندوں کو سائنس کے اس دور میں کچھ کامیابیاں حاصل ہوئیں جب دنیا کے لوگ کلیسا کے جبر سے ابھی نکلے ہی تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اپنے اندر کی خواہش کو سائنس کے نظریات کی صورت بیان کرنا شروع کیا اور ایک تسلسل کے ساتھ مذہب کی اس عمارت کو منہدم کرنے میں مصروف ہو گئے جس کا وقار اہل کلیسا پہلے ہی گنوا چکے تھے۔ اس لیے عوامی سطح پر ان کو کسی خاص مداخلت کا سامنا نہ کرنا پڑا اگرچہ علمی سطح پر ان کے اس اقدام کی خوب مذمت ہوئی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس لیے خدا کی نفی کا تصور ایک خاص ذہنیت کے حامل لوگوں کے دماغ کا گند تھا نہ کہ کوئی سائنسی اصطلاح۔ ان کی دلیل روزِ اول سے کمزور تھی جس کو کچھ ہی عرصے بعد ان کے ماعصر فلاسفہ اور اہل دانش نے رد کر دیا تھا۔

مثال کے طور پہ مذہبی لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سمندروں میں جوار بھاٹا لانے والا خدا ہے۔ اب جدید دور کا ایک ملحد اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے تجربے اور مشاہدے نے مجھے بتایا ہے کہ سمندروں میں اٹھنے والا جوار بھاٹا در حقیقت چاند کی کشش اور دنیا کے سمندروں اور خشکی کے ٹکروں کی جغرا فیائی ہیت (Geograrhical Configuration) کے سبب سے ہوتا ہے تو سائنس دانوں کا یہ انکشاف قبول کر لینے میں مذہب پسندوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا اور نہ ہی یہ انکشاف ان کے عقیدے میں کسی تبدیلی کا باعث بن سکتا ہے اس لیے کہ طوفان، قوت کشش اور زمین کی جغرافیائی بناوٹ کی وجہ سے ہونے والی کسی تبدیلی کا ان کے عقائد سے کیا تعلق وہ تو پہلے ہی جانتے ہیں کہ یہ طوفان یہ کشش ثقل، یہ زمین کی جغرافیائی بناوٹ خدا کی مخلوقات ہی ہیں۔ اب اگر خدا ان قوتوں کے باہمی اتصال سے کوئی فعل انجام دیتا ہے تو دیتا رہے۔

وہ خالق ہے اُس کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کائنات میں چاہے جس طرح کا بھی تصرف کرے۔ اب اگر کوئی ملحد کہے کہ نہیں یہ بات نہیں تو اس سے کہا جا سکتا ہے کہ پھر وہ اپنے ارادے سے کسی سمندر میں جوار بھاٹا لا کے دکھا دے۔ اس بے وقوف کو یہ نہیں پتا کہ اپنے علم سے اس نے جوار بھاٹا کی حقیقت کو جان کر خدا کو دریافت کیا ہے اب اگر کسی کا علم ہی کسی کے لیے حجاب بن جائے تو کوئی دوسرا کیا کر سکتا ہے۔ حالانکہ اسی کا

بڑا بھائی اسی کا ہم قبیلہ جان ولسن بھی اس کی عقل پہ ماتم کر رہا ہے اور اس کو حقیقت کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتا ہے جان ولسن اپنی کتاب (Philosophy and Religion) میں لکھتا ہے کہ:

This does,nt destroy my belif ;It is still Gog working through these things .who is responsible for the tides.

''وہ خدا ہی ہے جوان ذرائع سے کام لے کر اپنا فعل انجام دیتا ہے اور خدا آج بھی طوفان کا حقیقی سبب ہے''۔



اسی طرح حیاتیات کے میدان میں نظریہ ارتقاء کے حوالے سے یہ بات بار بار دھرائی جاتی ہے کہ حیاتیاتی عمل اب کسی ماورائے فطرت ذریعہ کی موجودگی کا تقاضا نہیں کرتا۔ دوسرے لفظوں میں زندگی کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے کسی باشعور خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ جدید سائنس سے ثابت ہو رہا ہے کہ زندگی صرف چند مادی طاقتوں سے خود بخود حاصل ہونے والا ایک نتیجہ ہے۔ یعنی ان کے خیال میں تولد و تناسل کے ذریعے سے مزید زندگیوں کا پیدا ہونا اور پیدا شدہ نسل کے بعض افراد میں کچھ فرقوں کا ظہور اور پھر ان فرقوں کا پشت ہا پشت ترقی کرنا اور ختم ہو جانا ہے۔ اس طرح مخالفین مذہب کے نقطہ نظر میں ڈارون کے انتخاب طبیعی کے اصول کا حیاتیاتی مظاہر پر انطباق اس کو ممکن اور ضروری بنا دیتا ہے کہ زندگی کی نشو و نما پر خدا کی کارفرمائی کے تصور کو ترک کر دیا جائے۔ اگرچہ ابھی تک بذات خود یہ بات بھی غیر ثابت شدہ ہے کہ انواع حیات فی الواقع اسی طرح وجود میں آئی ہیں جیسا کہ ارتقاء پسند علماء بتاتے ہیں۔

تاہم اگر اس امر کو چند لمحوں کے لیے درست بھی تصور کر لیا جائے تب بھی اس سے مذہبی عقیدے کے تنزل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ انواعِ حیات اگر بالفرض ارتقائی عمل کے تحت ہی وجود میں آئی ہوں تب بھی یکساں درجہ کی قوت کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ خدائی تخلیق کا طریقہ کار ہے نہ کہ کسی اندھے مادی عمل کا خود بخود نتیجہ، حقیقت یہ ہے کہ مشینی ارتقاء کو نہایت آسانی کے ساتھ تخلیقی ارتقاء (Creational Evolution) ثابت کیا جا سکتا ہے اور سائنس کی بیساکھیوں کے سہارے مذہب کی مخالفت کرنے

والوں کے پاس اس کی تردید کی کوئی واقعی بنیاد نہ ہوگی۔ کیونکہ جو چیز مشاہدے میں آئی ہے وہ ارتقاء ہے نہ کہ مشیئیت۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس نے بیسویں صدی میں اپنے اس اعتماد کو کھو دیا جس نے انھیں خالق کے وجود سے بھی بیگانہ کر دیا تھا۔ آج جب خود سائنس اپنے بوسیدہ نظریات کو ردی کی ٹوکری میں ڈال رہی ہے اور ان کی جگہ نئے نظریات لے رہے ہیں تو اس سے ثابت ہوا کہ سائنس کوئی ایسا حتمی علم نہیں ہے جس کو الہام پر فوقیت دی جاسکے۔ کل سارے عالم میں نیوٹن کا ڈنکا بج رہا تھا آج آئین سٹائن نے اس کی جگہ لے لی ہے پلانگ اور ہیزن برگ نے لاپلاس کے نظریات کو منسوخ کر دیا ہے۔ چنانچہ اب مذہب کے مخالفین اس بند گلی میں کھڑے ہیں جہاں سائنس اور اس کے جدید نظریات ان کی مدد کرنے سے انکاری ہیں کیونکہ آئن سٹائن کے نظریہ اضافت (Relativity) اور کوانٹم تھیوری نے خود سائنس دانوں کو اس نتیجہ تک پہنچا دیا ہے کہ وہ اس بات کا اعتراف کر لیں کہ یہ ناممکن ہے کہ سائنس میں مشاہد (Observer) کو مشاہدہ سے الگ کیا جاسکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی چیز کے صرف چند خارجی مظاہر کو دیکھ سکتے ہیں اور اس کی اصل حقیقت کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔

بیسویں صدی میں سائنس کے اندر جو انقلاب ہوا ہے اس نے خود سائنسی نقطہ نظر سے مذہب کی اہمیت ثابت کر دی ہے۔ سائنس میں جو چیز جدید انقلاب کہی جاسکتی ہے وہ اس واقعہ پر مشتمل ہے کہ نیوٹن کا نظریہ چونکہ دو سو سال تک سائنس کی دنیا پہ حکمران رہا وہ اب جدید مطالعہ کے بعد ناقص پایا گیا ہے۔ اگرچہ سابقہ فکر کی جگہ ابھی تک کوئی مکمل نظریہ سامنے نہیں آسکا مگر یہ واضح ہے کہ نئے رجحان کے فلسفیانہ تقاضے اس سے بالکل مختلف ہیں جو سابقہ نظریات کے تھے اور اب اس دعوے پر بھی خود علم سائنس ہی کی راکھ پڑ چکی ہے کہ صرف سائنٹیفک طریق مطالعہ ہی حقیقت کو معلوم کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ آج سائنس کے ممتاز علماء حیرت انگیز طور پہ اصرار کر رہے ہیں کہ:

Science gives us but a parrial knowledge of reality

''سائنس ہم کو صداقت کا صرف جزئی علم دیتی ہے''



سائنسی رجحان میں یہ تبدیلی اچانک پیدا ہوئی ہے کہ بمشکل سو سال گذرے جب معروف سائنس دان (Tyndall) نے اپنے خطبہ بلفاسٹ میں اعلان کیا تھا کہ سائنس تنہا انسان کے تمام اہم معاملات سے بحث کرنے کے لیے کافی ہے۔اس دور میں سائنس دانوں نے اس قسم کے خیالات اس مفروضہ یقین کی بنیاد پر قائم کیے تھے کہ حقیقت تمام کی تمام صرف مادہ اور حرکت (Matter and Motion) پر مشتمل ہے۔تاہم تھوڑے عرصے کے بعد ہی اہل سائنس کے سامنے یہ بات کھل کے آ گئی کہ فطرت کی توجیہ محض مادہ اور حرکت کے اصولوں پر کی جانی ممکن نہیں۔

ادھر اٹھارویں صدی کے آخر میں جب اہل سائنس کی تصورِ خالق سے بیزاری اپنے عروج پر تھی۔تب ''لاپلاس'' نے یہ کہنے کی جرأت کی کہ ایک عظیم ریاضی داں جو ابتدائی سحابیہ میں ذرات کے انتشار کو جانتا ہو وہ دنیا کے مستقبل کی پوری تاریخ پیشگی بیان کرسکتا ہے۔کیونکہ اس وقت نیوٹن اور اس کے نظریات کو تصورِ خالق پر ترجیح دی جارہی تھی اس لیے اس وقت اس بات پہ یقین کرلیا گیا کہ نیوٹن کا نظریہ ہی سارے علوم کی کنجی ہے اور اس کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

تاہم وقت نے اس مادہ پرست ذہن کو اپنے ہر پڑاؤ پر فطرت کے قوانین کے ذریعے شکست دی اور نیوٹن کے نظریات کی قلعی بھی جلد ہی کھل گئی۔اس کے نظریے کی غلطی پہلی بار اس وقت ظاہر ہوئی جب علماء نے روشنی کی مساوی تشریح کرنے کی کوشش کی اور یہ کوشش انھیں ایتھر (Ether) تک لے گئی جو بالکل مجہول اور ناقابل بیان عنصر ہے۔کچھ عرصہ تک یہ عجیب وغریب عقیدہ چلتا رہا اور روشنی کی مادی تعبیر کے حق میں ریاضیات کے خوب معجزے دکھائے گئے۔لیکن میکسویل (Maxwell) کے تجربات کی اشاعت کے بعد یہ مشکل ناقابل عبور نظر آنے لگی کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے تھا کہ روشنی ایک برقی مقناطیسی مظہر (Electromaganetic Phenomenon) ہے پھر وقت کے ساتھ یہ خلا بڑھتا ہی رہا یہاں تک کے وہ دن آیا جب علمائے سائنس پر واضح ہوا کہ نیوٹن کے نظریات میں کوئی بھی چیز مقدس نہیں۔بہت دنوں کے تذبذب اور بجلی کو مادہ (Mechanial) ثابت کرنے کی آخری کوششوں کے بعد بالآخر اس کو ناقابل تحویل عناصر (Irreducible Element) کی فہرست میں شامل کر دیا گیا۔بظاہر یہ ایک سادہ سی بات تھی مگر درحقیقت سائنس کے میدان کا یہ بہت اہم فیصلہ تھا۔نیوٹن کے تصور نے ہم کو بتایا تھا کہ ایک جسم کی کمیت اس کی مقدارِ مادہ تھی اور طاقت کا مسئلہ حرکت سے سمجھ آتا تھا اس طرح یقین کرلیا گیا کہ ہم اس فطرت کو جانتے ہیں جس کے متعلق ہم کلام کر رہے ہیں۔مگر یہ دراصل ایک واہمہ تھا کیونکہ بجلی کے

مطالعے سے ہمیں معلوم ہوا کہ اس کی فطرت ایسی ہے جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔اس کو معلوم اصطلاحوں میں تعبیر کرنے کی ساری کوششیں نا کام ہوگئیں۔وہ سب کچھ جو ہم بجلی کے متعلق جانتے ہیں وہ صرف یہ طریقہ ہے جس سے وہ ہمارے پیمائشی آلات کو متاثر کرتی ہے۔اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات کس قدر اہم ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے ایک ایسے وجود کو طبیعات میں تسلیم کر لیا جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔بعد میں اس نہج پہ اس قسم کے اور بھی وجود تسلیم کیے جانے لگے اور یہ مان لیا گیا کہ کچھ نا معلوم ہستیاں بھی نظریات بنانے میں وہی اہم کردار ادا کرتی ہیں جو اس سے پہلے صرف مادہ یا اس سے متعلق نظریات ادا کرتے تھے۔چنانچہ علمائے سائنس کے سامنے یہ حقیقت کھلی کہ جہاں تک علم طبیعات کا تعلق ہے تو اس کے ذریعے ہم کسی وجود کی اصلی ماہیت کو نہیں جان سکتے بلکہ اس کے صرف ریاضیاتی ڈھانچ (Mathematical Structure) کو جاننے کی کوشش کر سکتے ہیں۔اب اس اعلیٰ ترین سطح پر اس بات کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ علمائے سائنس کا یہ خیال کہ وہ مادی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اشیاء کی آخری ماہیت کو جان سکتے ہیں محض ایک واہمہ تھا۔چنانچہ بیسویں صدی کے انجام پر جب رسل کو دنیائے سائنس اور فلسفے کا شہنشاہ جانا جاتا تھا وہ بڑی بے بسی سے کہتا ہے؛

"ہم صرف اشیاء کے درمیان باہمی تعلق کو جانتے ہیں ہمیں اشیاء کی فطرت سے آگاہی حاصل نہیں ہو سکی۔لارڈ رسل ایک اور جگہ اپنے علمی سفر کے دوران نارسائی کے تجربات بیان کرتے ہوئے اپنی کیفیت کچھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ میں ایک ایسے آدمی کی طرح ہوں جو ایک وسیع و عریض سمندر میں ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھا ہوا ہو ہر طرف گھپ اندھیرا ہے اور میرے پاس چپو بھی نہیں بعض دفعہ روشنی آتی ہے تو میں تھوڑا سا رستہ دیکھ لیتا ہوں اور اس کے بعد دوبارہ مکمل تاریکی میں گم ہو جاتا ہوں"۔



چنانچہ جمالیاتی اخلاق اور روحانی پہلوؤں سے قطع نظر کمیت مادہ جوہر وسعت اور مدت وغیرہ جو خالص طبیعات کے دائرے کی چیزیں ہیں ان کی کیفیات کو جاننا بھی ہمارے لیے ویسا ہی مشکل ہے جیسے غیر مادی چیزوں کی حقیقت کو جاننا۔اس لیے کہ موجودہ علم طبیعات اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں کی حیثیت

سے براہ راست واقف ہو سکے۔ ان کی حقیقت ادراک سے باہر ہے۔ دراصل میدانِ سائنس کے لوگ بھی شاعروں کی طرح اپنے تصورات کے ابتدائی خدوخال ذہنی خاکوں کی مدد سے ہی تیار کرتے ہیں مگر ذہن کے اندر کسی ایسی چیز کا عکس موجود ہی نہیں ہوتا جس کا وجود ابھی عالم عدم سے عالم ظاہر کو منتقل نہ ہوا ہو۔ چنانچہ اس طرح سائنس اپنے حقیقی مطالعہ کے اعتبار سے ان خارج از ادراک خصوصیات کا مطالعہ نہیں کرسکتی جو پہلے سے اس کے ذہن میں موجود نہ ہوں۔ اس لیے مارٹن وائٹ نے اپنی کتاب (The Limitations of Science) میں لکھا ہے:

''یہ صحیح ہے کہ یہ مطالعہ عمل کائنات کی بعض خصوصیات کو منعکس بھی کرتا ہے مگر پھر بھی انسان اور سائنس کی یہ معلومات آلاتی مطالعہ سے متعلق ہیں نہ کہ اشیاء کی حقیقی خصوصیات سے متعلق۔ یہ واقعہ کہ سائنس صرف اشیاء کے ڈھانچہ کی حد تک محدود ہے بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت ابھی پورے طور پہ معلوم مشاہدہ نہیں ہے۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے احساسات یا خدا سے اتصال کا عارفانہ تجربہ اپنا کوئی خارجی جواب نہیں (Objective Conuterpart) رکھتا۔ یہ قطعی ممکن ہے کہ ایسا کوئی جواب خارج میں موجود ہو۔ ہمارے مذہبی اور جمالیاتی احساسات اب محض فریب (IlUsory phenomenon) نہیں کہے جا سکتے جیسا کہ پہلے سمجھا جاتا تھا نئی سائنسی دنیا میں مذہبی عارف بھی ایک حقیقت کے طور پہ رہ سکتا ہے''۔



اس سے اگلے دور میں مادہ پرستانہ اور ملحد طرزِ فکر کا مقابلہ خود ان کے اپنوں سے تھا اور خود قبیلہ سائنس میں سے واہٹ ہیڈ، ایڈنگٹن اور جینز نے اس نئی جنگ کا آغاز کیا جس نے مادیت پرستی یعنی خالق سے انکار کی روش اور علم سائنس کو الگ کر دیا تھا۔ ان علماء کی فکر صریح طور پہ کائنات کی مادی تعبیر کی نفی کرتی ہے مگر ان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے خود جدید طبیعات اور ریاضیات کے نتائج کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ چنانچہ ان مفکرین خاص طور پہ وائٹ ہیڈ کے بارے میں کہا گیا کہ؛

He is heroic thinker who tries to bread the lions of Intel letuaslism.Marteialism an positivizm in thier own bristling den

ترجمہ؛

یعنی وہ ایک بلند ہمت مفکر ہے جس نے مادہ پرستی کے شیروں کو عین ان کے بھٹ میں للکارا ہے۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

انگریز ماہر ریاضیات اور فلسفی ***Elfred erth whitehade*** نے کہا کہ:

Nature is a alive

یعنی کائنات بے روح مادہ نہیں بلکہ زندہ فطرت ہے۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

ایک اور انگریز ماہر فلکیات سر آرتھر اڈنگٹن نے موجودہ عہد کی سائنس کے نظریات پیش کرتے ہوئے اپنی کتاب (***The age of Analysis***) میں لکھتے ہیں کہ:

The stuff of the word is mind stuff

یعنی کائنات کا مادہ ایک ذہنی شئے ہے

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

پھر سر جینز جیمز جو ایک اور برطانوی مفکر ہے نے ریاضیاتی طبیعات کی جدید تحقیق ان الفاظ میں پیش کی ہے:

The universe is a universe of thought.

یعنی کائنات، مادی کائنات نہیں بلکہ تصوراتی کائنات ہے۔



یہ ان انتہائی مستند سائنس دانوں کے خیالات ہیں جن کا خلاصہ جے۔ڈبلیو این سولیون نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

The ultimate nature of the universe is mental.

کہ کائنات کی آخری ماہیت ذہن ہے۔



یہ ایک عظیم تبدیلی ہے جو پچھلی نصف صدی کے دوران سائنس کے اندر ہوئی ہے اس تبدیلی کا اہم ترین پہلو جے۔ڈبلیو۔این سولیون کے الفاظ میں پیش کیا ہے۔

''یہ نہیں کہ تمدنی ترقی کے لیے زیادہ طاقت حاصل ہوگئی ہے بلکہ یہ وہ تبدیلی ہے جو اس کی ما بعد الطبیعاتی بنیادوں (***Mataphysical Fondation***) میں واقع ہوئی ہے''۔



برطانیہ کے مشہور ماہر فلکیات اور ریاضی داں (***Sir james jeens***) کی کتاب (***The Mysterious Universe***) غالباً اس پہلو سے موجودہ زمانے کا سب سے قیمتی مواد ہے جس کے ذریعے مفکر خالص سائنسی بحث کے ذریعے اس نتیجے تک پہنچا ہے۔

''جدید طبیعیات کی روشنی میں کائنات مادی تشریح (***Material Representation***) کو قبول نہیں کرتی اور اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اب کائنات محض ایک ذہنی تصور (***Mental Concept***) ہو کے رہ گئی ہے آخری

حقیقت ذہن ہے یا مادہ۔ یہ فلسفیانہ الفاظ میں دراصل ایک سوال ہے کہ کائنات محض مادہ کے ذاتی عمل کے طور پہ خود بخود بن گئی ہے یا کوئی غیر مادی ہستی ہے جس نے بالارادہ اسے تخلیق کیا ہے جیسے کسی کار کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اپنے آخری تجزیے میں محض لوہے اور پیٹرول کا ایک اتفاقی مرکب ہے گویا یہ کہنا ہے کہ مشین سے پہلے صرف لوہا اور پیٹرول تھا اور اس نے خود ہی کسی اندھے مادی عمل کے تحت محض ایک اتفاق سے کار کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کے برعکس اگر یہ کہا جائے کہ یہ مشین اپنے آخری تجزیے میں انجینئر کا ذہن ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مشین سے پہلے ایک ذہن تھا جس نے مادہ سے الگ اس کے ڈیزائن کو سوچا اور پھر اپنے ارادہ کے تحت اسے تیار کیا ذہن کے تعین میں اختلاف سے ذہن کو آخری حقیقت ماننے والوں میں مختلف گروہ ہو سکتے ہیں جیسے خدا کو ماننے والے خدا کو ماننے کے باوجود مختلف گروہوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں مگر اس علمی مطالعہ کا یہ نتیجہ کہ کائنات کی آخری حقیقت ذہن ہے یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مذہب کی تصدیق اور الحاد کی تردید ہے"



(Sir james jeens) کے الفاظ یہ ہیں کہ جب کائنات ایک تصوراتی کائنات ہے تو اس کی تخلیق بھی ایک تصوراتی عمل سے ہونی چاہیے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ مادہ کو امواجِ برق سے تعبیر کرنے کا جدید نظریہ انسانی تخیل کے لیے بالکل نا قابل ادراک ہے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لہریں محض امکان کی لہریں (Waves of probabilities) ہو سکتی ہیں یہ اور اس طرح کے دیگر وجوہ کی بنا پر سر جیمز جینز اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ کائنات کی حقیقت مادہ نہیں بلکہ تصور ہے۔ یہ تصور کہاں واقعہ ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ایک عظیم کائناتی ریاضی دان (Mathematical Thinker) کے ذہن میں ہے کیونکہ اس کا ڈھانچہ جو ہمارے علم میں آتا ہے وہ مکمل طور پہ ریاضیاتی ڈھانچہ ہے۔ چنانچہ اب عالم سائنس اس امر پہ مجبور نظر آتا ہے کہ وہ ذہن کا عالمِ مادی کے خالق اور حکمران کی حیثیت سے استقبال کریں۔ یہ ذہن بلا شبہ ہمارے شخصی ذہن کی طرح نہیں ہے بلکہ ایک ایسا ذہن ہے جس نے مادی ایٹم سے انسانی ذہن تخلیق کیا اور کائنات کی یہ ساری رونق اور ہما ہمی اور رنگ و بو سے سجی اس کی ایک ایک روش ایک اسکیم کی صورت پہلے سے

خالق کے ذہن میں موجود تھی اور جب اس (خدا) نے اپنے ارادہ کو تکمیل تک پہنچایا تو کائنات عدم سے وجود میں منتقل ہو گئی۔ چنانچہ آج خود ہمارا سائنسی علم ہم کو مجبور کرتا ہے کہ انسان اور کائنات پہ جلدی میں قائم ہونے والے ان نظریات پہ نظرِ ثانی کریں جو خالق کے تصور کے بغیر کسی دم کٹے شیر کی طرح نظر آتے ہیں۔ آج جب انسان نے اپنے پورے یقین کے ساتھ اس امر کو دریافت کر لیا ہے کہ کائنات ایک منصوبہ ساز یا حکمران (Designing or Controlling power) کے وجود کی شہادت دے رہی ہے جو مادیت اور الحاد پرستوں کی ایسی شکست ہے جس کے بعد کوئی جواز ان کی اہلیت ثابت نہیں کر سکتا اور بات صرف اتنی سی ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور سب اسی کے ارادے کی کار فرمائی ہے۔





صدیوں سے مادہ پرستانہ اور روحانی تہذیب کے یہ دونوں نظریات متوازی طور پہ زندہ ہیں۔اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان چونکہ مادی تہذیب کی ترقی میں کافی حد تک سنجیدہ تھا اس لیے اس نے اپنے لیے آسائش کے بے پناہ در وا کر لیے۔مگر اس کے برعکس وہ روحانی تہذیب کے معاملہ میں پوری طرح سنجیدہ نہ تھا اس لیے انسانی معاشروں کے اندر اس خلا نے جنم لیا جس کے بطن سے شرک الحاد اور دوسرے تمام قسم کے غلط فکری نظام وجود میں آئے۔اس نے کائنات میں موجود طبعی عناصر کو باہم جوڑ کے کار، موٹر سائیکل، کمپیوٹر اور ہوائی جہاز تو بنا لیے مگر مظاہر قدرت کے پس پردہ ان حقائق تک اس کی رسائی نہ ہو سکی جو انسانیت اور عقل کا حقیقی امتحان تھا۔اس نے دن اور رات کے تسلسل میں چھپے ہوئے اس اسرار کو پڑھنے کی کوئی کوشش نہ کی جو اسے خالق کی پہچان تک لے جاتے۔ بلکہ اس نے کائنات کے بہت سے واضح اشارات کی غلط توجیح کی جس کی وجہ سے وہ اکثر و بیشتر وجود خالق کے بارے میں تشکیک کا شکار رہا اور غلط عقائد کی غلام گردشوں میں ہراساں پھرتا رہا۔مثال کے طور پر مظاہر کائنات میں تنوع دیکھ کر اس نے خدائی میں تنوع کا عقیدہ قائم کر لیا کہ جب چیزیں

کئی ہیں تو خدا بھی کئی ہونے چاہییں۔ حالانکہ مظاہر کائنات میں تنوع خدا کی صفات میں تنوع کی علامت تھا نہ کہ خود خدائی میں۔ اسی طرح کائنات میں نظام تعلیل (Causatian) کی دریافت کو سائنس نے خود خدا کی دریافت قرار دے دیا حالانکہ وہ خدا کے طریق کار کی دریافت کے ہم معنی تھا نہ کہ خود خدا کی دریافت کے برابر؟

اللہ نے انسان کی مادی اور روحانی تہذیبوں کے ارتقاء کے لیے ضرورت کے تمام عناصر اسی کائنات میں رکھ دیئے ہیں۔ اب انسان کو جب خود کار سواریوں کی ضرورت پیش آئی تو اس نے طویل تجربے اور مشاہدے کے ذریعے عناصر کائنات کا باہم اس طرح استعمال کیا کہ اس نے کار اور ہوائی جہاز تیار کر لیے۔ سائنس کبھی بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ ان چیزوں کی تکمیل میں اس نے کوئی ایسا عنصر بھی استعمال کیا ہے جو کائنات کی حدود سے ماورا ہو؟ یہ ایسا ہی معاملہ ہے جیسے وینس ڈی میلو کا مشہورِ زمانہ مجسمہ تراشنے والے سنگ تراش سے جب سوال کیا گیا کہ اس نے اس مجسّمے کا بنیادی تصور کہاں سے حاصل کیا تو اس نے یہ خوبصورت جواب دیا کہ یہ حسین صورت تو اس پتھر میں موجود تھی میں نے تو صرف اضافی پتھر کو ہٹایا ہے جس کے بعد یہ صورت ظاہر ہوگئی۔ اسی طرح کا معاملہ ان تمام جدید ایجادات کا ہے جن کو دریافت کرنے کے بعد انسان اس احساسِ تکبر کا شکار ہوا جس نے اسے خالق کے وجود سے انکار پر اکسایا۔ حالانکہ خالق نے انسان کی بنیادی ضروریات کی تمام اشیاء انسان کو پیدا کرنے سے پہلے اس دنیا پہ اتاریں تھیں تا کہ وہ خلافت فی الارض کا فریضہ احسن طور پہ ادا کر سکے۔ اس نے ہوا پانی اور روشنی جیسی چیزیں تو اپنی مکمل شکل میں اتاریں کہ انسان ان کو بنانے پہ قادر نہ تھا۔ مگر کار ہوائی جہاز اور کمپیوٹر کو مختلف اجزا کی صورت میں زمین پہ اتارا کہ وہ جانتا تھا کہ میں نے عقل کی جو شمع انسان کے اندر روشن کی ہے وہ اس کی روشنی میں ان اجزا کو باہم جوڑ کے کار ہوائی جہاز اور کمپیوٹر بنا لے گا۔

چنانچہ حیرت کی بات یہ ہے کہ کیا کسی کے پاس جدید طرز کی رہائش گاہ اور اچھی کار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے خدا کا وجود بے معنی ہو گیا ہے؟

کیا جدید مواصلاتی نظام انٹرنیٹ ٹیلی فون اور موبائل کے ذریعے خبر رسانی سے وحی و الہام کے عقیدے کی تردید ہو جاتی ہے؟

کیا ہوائی جہاز اور خلائی راکٹ میں بیٹھ کر فضاء میں اڑنے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کا اس کائنات

میں کہیں وجود ہی نہیں ہے؟

کیا لذیذ کھانے خوشنما لباس اور اعلیٰ فرنیچر کے وجود میں آنے کے بعد جنت اور دوزخ کو ماننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی؟

کیا جدید عورتوں کی یہ صلاحیت کہ وہ ہمارے دفاتر میں تنگ شرٹ پہنے تیزی سے کی بورڈ پہ انگلیاں چلاسکتی ہیں یہ ثابت کرتی ہے کہ اب " اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ " کی آیت منسوخ ہو گئی ہے؟

کیا اسمبلی اور پارلیمنٹ کی شاندار عمارتوں میں بیٹھ کر قانون سازی کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ اب شریعت کا قانون بے معنی ہو گیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ مادہ پرست ان تمام سوالوں کا جواب دینے سے قاصر ہیں اس لیے کہ جدید طرزِ زندگی یا تیز رفتار طورِ زیست کا مذہب کی ابدی صداقتوں کی تردید یا تائید سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ مذہب کا تعلق انسانی کی اخلاقی قدروں (Moral Values) سے ہے نہ کہ تمدنی مظاہر سے۔ کیونکہ تمدنی مظاہر تو ہمیشہ سے عمل ارتقاء کے ہاتھوں شکست کھاتے آئے ہیں مگر انسان کی بنیادی قدریں آج بھی وہی ہیں جو دس ملین سال پہلے تھیں۔ کل بھی وہ کسی خالق کو پوجنے کا اشتیاق رکھتا تھا اور آج بھی دنیا کی 74% آبادی چاہے نہ چاہے کسی خالق کے در سے ہی وابستہ ہے دوسرے لفظوں میں مذہبی ہے۔

لاکھوں سال پہلے بھی انسان کا عورت کی طرف رغبت کا یہی حال تھا جو کہ آج ہے لاکھوں سال پہلے بھی وہ اپنے منہ سے ہی کھانا کھاتا تھا اور آج بھی منہ ہی سے کھاتا ہے ناک سے نہیں، لاکھوں سال پہلے بھی وہ مل جل کر ایک سماج کی صورت رہتا تھا اور آج بھی وہ بڑے بڑے اور متمدن شہروں میں اکٹھے رہنا پسند کرتا ہے لاکھوں سال پہلے بھی وہ اپنی اولاد سے محبت کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہے، لاکھوں سال پہلے بھی وہ حسن پرست تھا اور آج بھی ہے، لاکھوں سال پہلے بھی وہ مال وزر کی محبت کا شکار تھا اور آج بھی اس کا وہی حال ہے لاکھوں سال پہلے بھی وہ احساس تفاخر اور قومی عصبیت میں مبتلا تھا اور آج بھی صورت حال کچھ ویسی ہی ہے لاکھوں سال پہلے بھی اسے پھول کا حسن اور اس کی خوشبو اسے متاثر کرتی تھی آج بھی کرتی ہے، لاکھوں سال پہلے بھی وہ بدلتے موسموں کے تغیر کا احساس لطیف رکھتا تھا اور آج بھی وہ موسم کے حسن سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ اب جہاں تک تمدنی مظاہر کا تعلق ہے تو وہ ہر زمانے میں بدلتے رہے ہیں اگر آج کی جدید اور تیز رفتار

سواریوں نے کل کی فرسودہ اور سست رفتار سواریوں کی جگہ لے لی ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ اس سے مسئلے کی نوعی صورت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا کہ کل کی سواریاں ہوں یا آج کی ان کے بنانے اور استعمال کرنے میں بنیادی اخلاقی اصولوں کی ضرورت کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ پیغام رسانی کے لیے آج کا جدید مواصلاتی نظام ہو یا کل کا فرسودہ نظام مگر اس بنیادی سوال کی اہمیت میں اب بھی کوئی فرق نہیں ہوا کہ اس نظام مواصلات کو جھوٹ کی اشاعت کے لیے استعمال کیا جائے یا سچ کی اشاعت کے لیے۔ کسی قانون ساز ادارے کا رکن قانون بنانے کے لیے اسمبلی حال میں چاہے ہوائی جہاز پہ بیٹھ کے پہنچے یا گدھے پر سوال یہی ہے کہ اس نے جو قانون بنایا ہے وہ خدائی قانون کی موافقت میں بنایا ہے یا کہ مخالفت میں۔ اگر اس نے قانون سازی کرتے ہوئے اُن حدود کی پرواہ نہیں کہ جس کو خالق کائنات نے مقرر کیا ہے اور جس کے مطابق ساری کائنات کا نظام جاری وساری ہے تو اس نے انحراف کی راہ اپنائی ہے اور خالق سمیت کائنات کے کل وسائل کو اپنے خلاف صف آرا کر لیا جس کی سزا اسے بھی بھگتنی ہوگی اور اس کی قوم کو بھی۔

اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ اہل مغرب کے کئی ممالک نے ہم جنسی کو قانونی جواز فراہم کیا ہے جس کی سزا انھیں ایڈز کی صورت بھگتنی پڑ رہی ہے اور ان کا بے پناہ روپیہ اور وسائل ایڈز سے بچاؤ پہ استعمال ہو رہے ہیں مگر اِن کے مریضوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ریکارڈ کیا جا رہا ہے اس لیے کہ ان معاشروں نے زنا کو روکنے کے لیے کوئی قانونی اور اخلاقی جواز فراہم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ چنانچہ آج کے انسان نے جب مادی تعیش کی لذت چکھی تو وہ اس کے سحر میں اس بری طرح مبتلا ہوا کہ اس کے پاس اپنی ذات پہ غور کرنے کے لیے بھی وقت نہ بچا ورنہ اس کی اپنی ذات میں بھی خالق کی پہچان کے درواکرنے کی سینکڑوں نشانیاں موجود ہیں۔ آیئے ان پہ ایک نظر ڈالیں۔ جب ہم اس نقطہ نظر سے انسان اور کائنات کے معاملے پر غور کرتے ہیں تو انسان کی ذات کے اندر پنہاں بہت سی چیزیں ہماری راہنمائی کے لیے قطار باندھے کھڑی نظر آتی ہیں مثلاً ''ہنسی'' انسان جب غور کرتا ہے تو حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ پوری کائنات میں صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو ہنستی ہے۔ اگرچہ اس کے مقابل بہت سی پر ہیبت اور بارعب مخلوقات بھی موجود ہیں مگر وہ اس لطیف احساس سے عاری ہیں جیسے کہ پہاڑ، پانی، ہوا، سمندر، جنگل، سورج، چاند ستارے بھی اس احساس سے عاری ہیں کیا آپ نے کبھی ان کو مسکراتے دیکھا ہے؟ حتیٰ کہ جدید سائنس نے ہی یہ انکشاف کیا ہے کہ جانور اور پرندے بھی اس احساس سے عاری ہیں۔ چنانچہ یہ ثابت ہوا کہ ہنسنا مسکرانا صرف حضرت انسان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ مسکرانا شعوری لذت کی علامت ہے اور

لذت کا شعور انسان کے سوا کائنات کی اور کسی مخلوق کو حاصل نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری معلوم کائنات میں انسان ہی ایک ایسی ہستی ہے جس کے لیے ہنسنا یا بالفاظ دیگر خوشی مقدر کی گئی ہے۔ خوشی انسان کو وہ احساس لطیف عطا کرتی ہے جو اس کے اندر کسی ان دیکھی طاقت کے وجود کو دلیل فراہم کرتی ہے جس کی رحمت کی وجہ سے اسے خوشی اور مسرت کا یہ لمحہ حاصل ہوا اور ان لمحات میں طوالت اس کے اندر شکر کے جذبے کو جنم دیتی ہے۔ جب کسی انسان کے اندر جذبہ شکر زندہ ہو جائے تو اب وہ خالق کے در پہ کھڑا ہے اور جب چاہے قدم اٹھا کے ادراک کی وہ منزلیں طے کر لے جو اسے مقصد زیست کی اصل حقیقت سے آگاہ کر دیں گی۔ ذرا سا مزید غور کرنے پر انسان کی ذات کا ایک اور در وا ہوتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ لذت کا حصول بھی انسان ہی کا خاصہ ہے اور انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو لذت کے بہت سے پہلوؤں سے آشنا ہے۔ اس کا کھانا پینا رہنا پہننا اور ازدواجی تعلقات سب لذت کے دائرے میں آتے ہیں۔ بظاہر انسان اور جانور میں یہاں کچھ قدریں مشترک نظر آتی ہیں مگر یاد رہے کہ جانور ہمیشہ اپنی اس جبلت کا تابع رہا ہے جو اس کو خالق کائنات نے روز اول سے عطا کر دی تھی اس کا کھانا پینا اور نسل بڑھانے کا تعلق لذت کے زمرے میں نہیں بلکہ جبلت کے زمرے میں آتے ہیں۔ جانور جو عمل بھی کرتے ہیں وہ ضرورت اور جبلت کے لیے کرتے ہیں نہ کہ لذت کے لیے۔

اس لیے صرف انسان ہی وہ ہستی ہے جو لذت کے ہمہ پہلو تصور سے آشنا ہے کسی گدھے کو گلاب کی کلیوں کی نازکی اور اس کی مہین خوشبو کا ادراک کبھی حاصل نہ تھا جب کہ انسان شعوری ابتدا سے ہی بادِ صبا کی لذت اور قوس قزح کے حسن سے آگاہ تھا۔ چنانچہ انسانی ذات کے اندر پنہاں خوشی اور لذت کے احساس کے حوالے سے ہی ہم اس کی کامیابی کے معیار کو جانچیں تو ہم سمجھیں گے کہ صرف وہی انسان کامیاب ہے جس کو خوشی اور لذت حاصل ہو۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ انسان کو خوشی اور لذت گاہے گاہے حاصل رہتی ہے۔ مگر اس کو دوام حاصل نہیں اور وہ خود اپنی قوت کار سے اپنی خوشی اور لذت کو دوام عطا کرنے پر بھی قادر نہیں۔ اس لیے کہ یہاں بہت سی محدودیتیں (Limitations) ہیں جنھوں نے اسے گھیرا ہوا ہے۔ خوشی اور لذت کے مقابل دکھ اور پریشانی بھی سر اٹھائے کھڑے ہیں جو اس کی خوشی اور لذت کو غارت کرتے رہتے ہیں اور دوسرے بہت سے امور اس کی خوشی اور لذت کی راہ میں زندہ حقیقتوں کی طرح حائل ہیں، دکھ ہے، بیماری ہے بڑھاپا ہے، اور پھر موت ہے جو اس کے احساسِ لذت کو دوام حاصل نہیں کرنے دیتی۔ ہم ارادہ کچھ اور کرتے ہیں اور نتیجہ کچھ اور نکلتا ہے۔ یہاں پہنچ کر ہم مزید غور کرتے ہیں تو انسانی رویوں کا ایک اور بہت اہم عنصر

ہمارے ہاتھ آتا ہے کہ یہ بھی انسانی خصوصیت ہے کہ تمام معلوم مخلوقات میں سے صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو کل (Tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔سورج آج ڈوبتا ہے اور کل طلوع ہوتا ہے یہ ہم جانتے ہیں خود سورج کو بھی اس کا شعور نہیں۔چیونٹی اگلے موسم کے لیے خوراک جمع کرتی ہے اور بیا اپنی آئندہ نسل کے لیے گھونسلے بناتا ہے مگر آج کی سائنس اس بات کو بخوبی جانتی ہے کہ وہ یہ سب اپنی جبلت (Instinct) کے تحت کرتے ہیں نہ کہ کل کے تصور کے تحت۔تمام موجودات میں سے کل کا تصور صرف انسان کے اندر پایا جاتا ہے جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کل کی کامیابی صرف انسان کے لیے خاص ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں جو خوشیاں جو لذتیں ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی کی محدودیتیں انسان کو اتنا وقت اتنی آسانی مہیا نہیں کرتیں وہ سب کل کو دستیاب ہوں گی اور کل کے دن کو مستقبل بھی کہا جاسکتا ہے اور اس تسلسل کو بھی کل ہی کہا جائے گا جو اس مادی جسم کی فنا کے بعد بھی جاری وساری ہے یعنی موت۔

اس کل کے راستے میں قطعاً کوئی رکاوٹ نہیں حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہم اپنی اس طلب کا صرف جزئی تعارف ہی حاصل کر پاتے ہیں اور اس کو کامل طور پہ پانے کے لیے ہمیں بہر حال کل کے دور میں داخل ہونا ہوگا اور کل کا یہی وہ تصور ہے جو اس دنیا میں انسانی زندگی کو ایک ایسے رستے کا راہی بناتا ہے جس میں نہ صرف اس انسان کی ذاتی فلاح کا تصور مضمر ہے بلکہ وہ باقی تمام لوگوں کے لیے بھی افادی اہمیت کا حامل ثابت ہوتا ہے۔ہر آدمی جب نیند کی حالت میں ہوتا ہے تو اس کا جسم ایک قسم کی موت کی آغوش میں ہوتا ہے مگر اس کا ذہن یا روح پوری طرح بیدار ہوتی ہے۔انسان دوران نیند سوچتا ہے، فیصلے کرتا ہے، سفر کرتا ہے گویا ایک قسم کی جسمانی موت کے بعد بھی انسان کا ذہنی وجود پوری طرح زندہ رہتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ آدمی نہ صرف کل کا تصور رکھتا ہے بلکہ وہ کل کے دن تک زندہ موجود بھی رہتا ہے موت کے باوجود وہ ختم نہیں ہوتا اور آدمی کی زندگی ایک ایسا تسلسل ہے جو ''آج'' سے لے کر ''کل'' تک چلا گیا ہے۔چنانچہ بعض جہلا کا یہ تصور کہ موت فناہ ہے بالکل ہی احمقانہ بات ہے بلکہ موت تو محض منظر کی تبدیلی کا نام ہے۔

اب ہم انسان کی ذات کے دروں اس احساس کا مشاہدہ کرتے ہیں جس کے تحت انسان کے اندر خیر اور شر کا یعنی (صحیح اور غلط) کا تصور جنم لیتا ہے اور یہ بھی صرف حضرت انسان کا ہی خاصہ ہے کہ وہ اشیاء کی ماہیت جان کر ان کے صحیح اور غلط ہونے کا تصور قائم کرتا ہے اور حقیقت واقعہ کا اعتراف اس کے نزدیک سب سے بڑی نیکی ہے اور حقیقت واقعہ کا انکار اس کے نزدیک سب سے بڑی برائی ہے۔چنانچہ اس شعور کے زندہ

ہوتے ہی انسان سچ اور جھوٹ، امانت اور خیانت، احسان اور ظلم، علم اور جہل، نیکی اور بدی، تواضع اور سرکشی عہد اور بدعہدی کے درمیان بھی فرق کرنا شروع کرتا ہے۔ دراصل یہی وہ حد فاصل ہے جو انسان کے معاملات کو دوسری مخلوقات کے معاملات سے الگ کر کے رکھ دیتی ہے اور انسان پہ اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ اس کی کامیابی اخلاقی معیار پہ جانچی جائے گی۔ جب کہ دوسری چیزوں کی کامیابی محض مادی اعتبار سے بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ انسانی زندگی کے ان تمام فطری مظاہر کو جاننے کے بعد حیات انسانی کا جو کامل تصور بنتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے جس کے لیے اس کے خالق نے لذت اور خوشی کو مقدر کیا ہے مگر یہ خوشی اور لذت اپنے حقیقی تصور میں اس کو آج ملنے والی نہیں ہے اور یہ اپنی کامل صورت میں اس کو صرف ''کل'' ہی ملے گی۔ مگر یہ لازوال نعمت ہر کسی کو یونہی نہیں مل جائے گی اس کے لیے انسان کو ایک امتحان درپیش ہے جس میں اسے کامیاب ہونا پڑے گا اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنی ''آج'' کی زندگی میں اس کے واقعی استحقاق کا ثبوت دے کیونکہ وہ لوگ اس لازوال نعمت کے حق دار کیسے قرار دیئے جاسکتے ہیں جو بہ بانگ دہل آج کسی خالق کے وجود سے انکار کر رہے ہیں۔

جو مذہب اور اس کے نظریات کو دھوکہ اور واہمہ قرار دیتے ہیں جو مذہب کو افیون بتاتے ہیں اور جو اتنے بد زبان ہیں کہ کہتے ہیں خدا مر گیا جو نہ صرف خود اندھیری راہوں کے مسافر ہیں بلکہ انہوں نے شیطان کی ذریت سے مل کر خالق کے انکار پہ پورا ایک نظام فلسفہ وضع کیا اور کروڑوں انسانوں کو درِ خالق سے موڑ کے رکھ دیا۔ اس دن وہ جان جائیں گے کہ دراصل وہ دانشور نہ تھے بلکہ عقل کے اتنے اندھے تھے کہ چمکتا دمکتا درِ خالق ان کی نظروں سے اوجھل رہا۔ خوشی اور لذت کی اس لازوال نعمت کا اصل حق دار وہی ہے جس نے نہ صرف اپنے خالق کو پہچانا بلکہ اس کے احسان کی قدر و قیمت کو بھی پہچان لیا۔ تو ایسا انسان ہی انکارِ حق سے بچے گا اور اقرارِ حق کی میزان پہ پورا اترے گا۔ خالق کے وجود کا احساس انسان کو سطحی طور پہ جینے کی بجائے ابدیت کی سطح پہ جینے کا شعور عطا کرتا ہے اور وہ صرف آج والا بن کے رہنے کی بجائے کل والا بن کے رہنا سیکھ لیتا ہے اور جس کو رحمت کی یہ راہ بھا گئی وہ کل کی زندگی میں کامل انسان کے روپ میں ظاہر ہوگا اور وہ اس خوشی اور لذت کو ابدی طور پہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس کا موجودہ زندگی میں اس نے محض تعارف ہی حاصل کیا تھا۔ پس ثابت ہوا کہ مادی تہذیب وقتی دنیا کی تعمیر کا نام ہے اور روحانی دنیا کی تعمیر ابدی دنیا کی تعمیر ہے۔ چنانچہ جب انسان کو یہ شعور حاصل ہو جائے کہ یہ ساری مادی تہذیب ریت پہ بنائے اس گھروندے کی مانند ہے جس کو قدرت کی ایک ہی لہر نے فنا کے گھاٹ اتار دینا ہے تو وہ اپنی ساری توانائیاں

اتنی ناپائیدار چیز کی تعمیر کے لیے کیوں کر صرف کرے گا۔یہی وہ سوال ہے جو مادہ پرست نظریات کی قلعی کھول دیتا ہے مگر انسان کے پاس وقت اور مہلت کم ہے اس لیے بعض اوقات اس کو بہت دیر کے بعد جا کے احساس ہوتا ہے کہ اس نے ایک طویل جدو جہد کے بعد زندگی سے کچھ بھی نہیں پایا اور اس کی باقی سانسیں احساسِ ندامت کی نظر ہو جاتیں ہیں۔جب اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ انسان ایک اخلاقی وجود ہے اور اس کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے ہر فعل کو غلط اور صحیح کے ترازو پہ تولتا ہے تو اس کے بعد وہ ایک ایسے ضابطے کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے جو اس کے شعور کے مطابق صحیح اور غلط کو متعین کرے۔

جانوروں کو جو ضابطہ اخلاق درکار تھا وہ خالق نے ابتدا سے ہی ان کی جبلت میں رکھ دیا مگر انسان اپنے ساتھ کوئی ضابطہ نہیں رکھتا جس سے ایک خلا پیدا ہوا اور یہ خلا بتاتا ہے کہ انسان کے لیے ضرورت ہے کہ باہر سے اس کو ایک ضابطہ اخلاق فراہم کیا جائے اور ''قانون'' یہی ضابطہ اخلاق فراہم کرنے کی ایک شعوری کوشش ہے مگر اس کا حال یہ ہے کہ پانچ ہزار سال کی بہترین کوششوں کے باوجود بھی انسانی دماغ اپنے لیے قانون کی کوئی متفقہ بنیاد دریافت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔اہل فلسفہ کا ایک طبقہ اس کو انسانی ناکامی تو ضرور قرار دیتا ہے مگر ان کا اصرار ہے کہ آخر انسان کوئی ایسا متفقہ ضابطہ وضع کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جسے انسانیت کے لیے باعث نجات قرار دیا جا سکے گا۔وہ کہتے ہیں کہ انسان ابھی شعور وارتقاء کی منازل طے کر رہا ہے۔مگر ابھی راستے میں ہے اور اس کو چند صدیاں مزید درکار ہیں جب وہ اپنی منزل کو پا لے گا مثلاً (Tocquevil) جیسے کتنے ہی نام نہاد دانشور انسان کو امید دلائے بیٹھے ہیں کہ وہ جلد ہی منزل پا لے گا اور اس نئی دنیا کے لیے ایک نیا علم سیاست دریافت کر لے گا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کی یہ ناکامی اس کی تلاش کی ناکامی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسی چیز کی تلاش میں ہے جس کی کھوج میں ناکامی بالآخر اس کا مقدر ہے۔اس لیے کہ وہ اپنی کوششوں سے اس خلا کو پر کرنے کے قابل ہی نہیں انسان کے اندر اخلاقی شعور کا موجود ہونا مگر اس کا خود سے کوئی اخلاقی ضابطہ وضع نہ کر سکنا نظام فطرت کا ایک خلا ہے اور یہی خلا ''وحی'' کی ضرورت کو ثابت کرتا ہے۔اگر ایک بار اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے بعد منزل خود انسان کے قدم چومے گی اور عقل انسانی کو اسلام کے سوا کوئی اور راہ سجھائی نہ دے گی۔کیونکہ جس طرح انسان کو اپنی زندگی کی مادی تعمیر کے لیے سورج کی روشنی کی مستقل ضرورت ہے اسی طرح اس کو اپنی زندگی کی روحانی اور اخلاقی تعمیر کے لیے ''علم وحی'' یعنی سچی ہدایت اسلام کی ضرورت ہے۔چنانچہ جو لوگ اسلام کو نہ اپنائیں گے وہ گویا اپنی روحانی اور اخلاقی تعمیر سے پہلو تہی کر رہے

ہیں اور روحانی تہذیب کے بجائے مادی تہذیب کو ترجیح دے رہے ہیں تو اس کے نتائج بھی یقیناً مادی ہی ہونگے اور روحانیت کے میدان میں ان کی تنگ دامانی نہ صرف ان کی زندگی میں اندھیرا کردے گی بلکہ ان کی آخرت بھی برباد ہوجائے گی حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سورج کے بغیر انسان کی دنیا اندھیری ہے اسی طرح علم وحی کے بغیر اس کی آخرت اندھیری ہے؟؟؟





کائنات ایک کھلی کتاب کی مانند ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ایک بولتی ہوئی کتاب ہے جو اپنی حقیقی ماہیت کو بیان کر رہی ہے اور ذرا سے غور پہ ہی مظاہرِ کائنات اپنے خالق کے کامل اقتدار اور اس کی مکمل دسترس پہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ انسان اس نظام کائنات میں ایک ناقابل ذکر ذرے کی طرح ہے مگر عقل نے اس کو وہ مقام عطا فرمایا ہے کہ اس نے اسرارِ کائنات پہ ہاتھ ڈال دیا۔ روزِ اول سے انسان کو یہ سوال درپیش رہا ہے کہ اس کائنات کو بنانے والا کون ہے؟ کون ہے جو اتنے وسیع نظام سلطنت کو بغیر کسی دِقت کے رواں رکھے ہوئے ہے۔ قدیم زمانوں میں انسان یہ سمجھتا تھا کہ بہت سی ان دیکھی طاقتیں اس کائنات کی مالک ہیں۔ اگرچہ وہ کسی ایک بڑے خدا کے قائل ضرور تھے۔ مگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا بھی اس بڑے خدا کی مدد کرتے ہیں تب جا کے وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اس کائنات کے نظام کو رواں دواں رکھ سکے۔ ایک مدت تک انسانی سماج میں کائنات کے متعلق کچھ اسی قسم کے عقائد مروّج رہے۔ پھر گذرتے وقت نے انسانی شعور کو جو پختگی عطا کی اس نے جہاں اور بہت سے پردے چاک کیے وہیں اس

کائنات کے اسرار بھی قدرے سِر کے اور علمی دنیا نے کائنات پہ متصرف بہت سے خداؤں کے تصور کو مسترد کر دیا۔ اگر چہ انسان نے علوم تمدن کی بہت سی منزلیں طے کیں مگر وہ کائنات کی کسی ایک توجیہ پہ متفق نہ ہو سکا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ بہت سے اہل دانش جو سرے سے کسی خالق کے وجود کے قائل ہی نہ تھے انھوں نے کائنات کے متعلق الہامی مذاہب میں دیئے جانے والے نظریات کو اس عناد کی بنا پر مسترد کر دیا کہ اس کے بعد خود ان کو اس خالق کے وجود کو بھی تسلیم کرنا پڑتا۔

سترہویں اور اٹھارویں صدی کے فلاسفہ اور سائنسدانوں نے باہمی مناپلی سے کائنات کے متعلق ایک نیا نظریہ پیش کیا جس کی بنیاد انھوں نے اس اتفاق کو قرار دیا جو ان کے خیال میں کائنات کا محرک اول بنا۔ بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ اگر چہ اس دور کے بہت سے لوگ خدا کی ذات سے شرک میں ملوث تھے مگر ان کے فلاسفہ اہل دانش اور سائنس دان ان سے کئی ہاتھ آگے الحاد کا شکار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ جدید دور کے انسان ہیں اس لیے انہیں کسی خالق کے وجود پہ ایمان لانے کی ضرورت نہیں کہ یہ تو ایک فرسودہ رسم ہے جس کی ضرورت گذرے کل کا نہتا اور بے بس انسان محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ شرک کی بجائے الحاد کے قائل ان فلاسفہ نے کائنات کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ کسی ذی شعور ہستی کی کارفرمائی نہیں بلکہ ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے اور جب کوئی واقعہ وجود میں آجائے تو اس کے سبب سے کچھ دوسرے واقعات بھی وجود میں آئیں گے۔ اس طرح اسباب و واقعات کا ایک لامتناعی سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اور یہی سلسلہ اسباب ہے جو اس نظام کائنات کو چلا رہا ہے۔

انھوں نے اس توجیہ کی بنیاد دو چیزوں پہ رکھی ایک اتفاق اور دوسرا قانونِ علت (Law of Causation) چنانچہ اس توجیہ کی بنیاد پہ انھوں نے کائنات کا جو ابتدائی تصور پیش کیا وہ یہ ہے کہ اب سے تقریباً دو ارب سال پہلے کائنات کا کوئی وجود نہ تھا۔ اس وقت نہ تو ستارے تھے اور نہ سیارے مگر فضاء میں ایک گہرا بادل سا موجود تھا جس کو مادہ کہا جاتا ہے۔ اس وقت یہ مادہ جمی ہوئی ٹھوس حالت میں نہ تھا بلکہ اپنی اس ابتدائی حالت میں تھا جس کو سائنس نے برقیے اور پروٹون قرار دیا۔ تب یہ برقیے اور پروٹون پوری فضائے بسیط میں یکساں طور پہ پھیلے ہوئے تھے یا یوں کہیے کہ انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرات کا ایک غبار تھا جس سے ہماری یہ کائنات بھری ہوئی تھی۔ اس وقت یہ مادہ بالکل توازن کی حالت میں تھا اور اس میں کوئی خفیف سی حرکت بھی نہ تھی۔ ریاضی دانوں کے نقطہ نگاہ سے یہ توازن ایسا تھا کہ اگر اس میں کوئی ذرا سا خلل بھی ڈال دے تو پھر یہ توازن بگڑ جائے گا اور اس توازن کے اندر ایک خلا جنم لے گا جو بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اگر

اس ابتدائی خلل کو مان لیا جائے تو ان لوگوں کے مطابق اس کے بعد کے تمام واقعات علم ریاضی کے ذریعے ثابت کیے جاسکتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ابتدائی خلل کا محرک کیا تھا؟

کیا اس کے پیچھے خالق کی منشا تھی؟

کیا اس ابتدائی اضطراب کی کوئی سائنسی توجیہ موجود ہے یا آج تک وجود میں آسکی ہے؟

کیا اتنا بڑے امر کو جس کے نتیجے میں ہماری یہ اتنی بڑی کائنات وجود میں آئی محض اتفاق قرار دیا جاسکتا ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب نہ کل کے سائنس دان اور فلاسفر دے سکے ہیں اور نہ ہی اس کا کوئی حتمی اور قابل قبول جواز آج کی سائنس فراہم کرسکتی ہے۔ لے دے کہ ان کے پاس ایک لفظ یا نظریہ اتفاق ہی رہ جاتا ہے جو ایک طفلانہ مذاق سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس لیے کہ کائنات میں پھیلے اس مادے میں وہ خفیف سی حرکت وہ ہلکا سا خلا وقوع پذیر ہوا تو اس کا سبب کیا تھا جس کے بعد وہ خلل بڑھتا ہی چلا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہو گیا اور یہی وہ جمع شدہ مادہ ہے جس کو آج ہم ستارے سیارے اور سحابیئے کہتے ہیں۔ کائنات کی یہ توجیہ سائنس کی طرف سے پیش کی گئی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اس قدر بودی اور کمزور توجیہ تھی کہ خود سائنس دانوں کو بھی کبھی اس پہ شرح صدر حاصل نہ ہوسکا۔

یہ توجیہ اس حقیقت کو تو تسلیم کرتی ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ کائنات کو پہلی بار کس نے حرکت دی۔ مگر اس کے باوجود ان کا اصرار ہے کہ انھوں نے کائنات کے محرکِ اول کو معلوم کرلیا ہے اور اس محرک اول کا نام ہے "اتفاق"؟؟؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کائنات میں صرف غیر متحرک مادہ تھا اور اس کے سوا کوئی چیز ایسی نہ تھی جو صاحبِ وجود ہو تو یہ عجیب وغریب قسم کا اتفاق کہاں سے وجود میں آ گیا جس نے ساری کائنات کو حرکت دے دی۔ جس واقعہ کے اسباب نہ مادہ کے اندر موجود تھے نہ مادہ کے باہر تو پھر وہ واقعہ وہ "حسین اتفاق" کیسے وجود میں آ گیا جس کے نتیجے میں رنگ ونور سے سجی یہ کائنات وجود میں آئی؟؟؟

پھر اسی فکر کا ایک اور بڑا تضاد یہ ہے کہ جب سائنس ہر واقعہ سے پہلے ایک واقعہ کا موجود ہونا ضروری قرار دیتی ہے جو بعد میں ظاہر ہونے والے واقعہ کا سبب بن سکے تو پھر کائنات کے بارے میں سائنس اپنے اس اصول سے کیوں پھر جاتی ہے اور کائنات کے واقعہ کی توجیہ ایک ایسے واقعہ سے کیوں کرتی ہے جس سے پہلے

اس کا سبب ہی موجود نہیں۔ چنانچہ یہی وہ بے بنیاد مفروضہ ہے جس پہ کائنات کی اتفاقی پیدائش کے نظریے کی پوری عمارت کھڑی کردی گئی۔ ان کے وضع کردہ قانون علت (Law of Causation) کی لغویت تو قاری کے سامنے آ گئی۔ اب اگر کائنات اور اس نظام تسلسل پہ ایک اور نگاہِ تدبر ڈالیں تو اس نظریے کے غبارے سے رہی سہی ہوا بھی نکل جائے گی۔

ذرا چند لمحوں کے لیے اگر ان کے نظریہ قانونِ علت ہی کو حقیقت مان لیا جائے تو بھی اس میں اتنی بے شمار کمزوریاں ہیں کہ اسے آسانی سے طفلانہ سوچ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر ان کی یہ بات مان لی جائے کہ یہ کائنات محض ایک اتفاق سے وجود میں آ گئی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعات لازمی طور پر وہی رخ اختیار کرنے پر مجبور تھے جو انھوں نے اختیار کیے؟

کیا اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا کیا ایسے ممکن نہ تھا کہ ستارے اور سیارے آپس میں ٹکرا کر تباہ و برباد ہو جاتے؟

پھر اس پرسکون مادہ میں حرکت پیدا ہونے کے بعد کیا یہ ضروری تھا کہ یہ محض ایک حرکت نہ رہے بلکہ ایک ارتقائی حرکت بن جائے اور ایک حیرت انگیز تسلسل کیساتھ موجودہ کائنات کو وجود میں لانے کی طرف دوڑنا شروع کردے؟

آخر وہ کون سی منطق تھی جس نے ستاروں کے وجود میں آتے ہی ان کو لامتناہی خلا میں نہایت باقاعدگی کے ساتھ پھرانا شروع کر دیا اور آناً فاناً ایک ایسا نظام شمسی مرتب ہو گیا جس کی حرکتوں کے دائرے آج تک انسانی علوم کے دائرے سے دور ہیں اور انسان محض نظروں کے سامنے سجے اپنے ہی ایک نظام شمسی میں الجھ کے رہ گیا ہے جبکہ خود سائنس کا دعویٰ ہے کہ کائنات میں ایسے سینکڑوں نظام شمسی موجود ہیں؟؟؟

کیا ان کا وہ ''اتفاق'' کوئی طلسمی کرشمہ تھا جس نے کائنات کے بعید ترین گوشوں تک اس نظام شمسی کو پھیلا دیا؟

پھر وہ کون سی منطق تھی جس کی بنا پر خود ہماری زمین پر عجیب وغریب تبدیلیاں وجود میں آئیں جن کی وجہ سے یہاں زندگی کا قیام ممکن ہو سکا؟

یہاں ہوا ہے، پانی ہے، پھول ہیں، درخت ہیں، پہاڑ ہیں، پھل ہیں، بدلتے موسم ہیں، بہتے چشمے

ہیں، برستے بادل ہیں، ٹھنڈی ہوائیں ہیں، کوئی ایک بھی تو ایسی کمی نہ تھی جو وجود انسان کے ارتقاء کے راستے میں حائل ہوتی؟

بلکہ اس کے برعکس یہاں کے انتظامات خود اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اللہ کی مرضی کیا تھی؟

وہ اس کرہ ارض پہ اس رونق کو دیکھنا چاہتا تھا جو آج ہمارے گرد و پیش میں چہار سو سجی ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ خالق کے تخیل کو ہی ثبات ہے۔سائنس اس معاملے میں بھی آج بے بس دکھائی دیتی ہے کہ وہ اس وسیع و عریض کائنات میں کسی اور ایسی دنیا کا سراغ لگائے جہاں ایسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہوں جیسی کہ ہمارے اس کرہ ءارض میں ہوئیں تھیں جن کی وجہ سے یہاں انسانی زندگی کا بقاء ممکن ہوا۔

کیا سائنس اس سوال کا جواب دے سکتی ہے کہ زمین پر زندگی کیوں کر اور کس طرح وجود میں آئی اور کس قانون کے تحت مسلسل پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے؟

پھر وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک چھوٹے سے رقبہ میں حیرت انگیز طور پر وہ تمام چیزیں اکھٹی کر دیں جو انسانی تمدن کے لیے درکار تھیں؟

پھر وہ کون سی وجہ تھی جو ان حالات کو ہمارے لیے مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے جو انسانی بقاء کے لیے درکار ہیں کیا؟

کیا محض ایک اتفاق کا پیش آ جانا اس بات کی کافی وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ سارے واقعات اس قدر حسن ترتیب کے ساتھ مسلسل پیش آتے چلے جائیں اور اربوں کھربوں سال تک ان کا سلسلہ بغیر کسی تعطل کے جاری رہے اور پھر بھی ان میں کوئی فرق نہ آئے نہ زمین سے پانی کم ہو نہ کوئی انسان کرہ ءارض پہ آکسیجن کی کمی کی شکایت کرے، نہ کوئی سر پھرا آج تک اس کائنات میں اس کمی کا دعویٰ کر سکا ہو جو اس کے خیال میں انسانی بود و باش میں رکاوٹ کا باعث بنے۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان اپنی اذیت کا باعث خود ہی بنتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ۔

القرآن الحکیم (سورۃ روم ۳۰ ۔ ۴۱)

ترجمہ:

''خشکی اور تری میں جو بھی فساد ہے وہ خود انسان کے اپنے ہی ہاتھ کی کمائی ہے''۔



سائنس کو خدا جاننے والے دل اگر ہدایت پہ راغب ہوں تو کائنات کی کھلی کتاب کا ہر صفحہ ان کی راہنمائی کے لیے ہر لمحے تیار ہے۔ مگر جب کوئی خالق پہ ہی بہتان باندھنے کی روش اپنا لے تو اس کے دل پہ مہر لگا دی جاتی ہے۔ ذرا سی نگاہ عمیق ہمارے اردگرد بہت سے ایسے کرداروں کی نشاندہی کر دے گی جو زبان سے چاہے خالق کے وجود کا انکار نہ کریں کہ ہماری سماجی روایات ان کو اس کی اجازت نہ دیں گی مگر عملاً خالق کے وجود سے انکار کرنے والوں کا ایک انبوہ ہے جو ہر وقت مادیت کی بات کرتا ہے اور روحانیت سے انکاری ہے اور ان کا دماغ خالق کے سامنے پیش ہونے کے کسی بھی احساس سے انکاری ہے۔

اس بحث کے آغاز سے ہم اس حقیقت کی تلاش میں ہیں کہ وہ کون سا امر تھا جس کی بنا پہ یہ ہمہ پہلو اور خوشبوؤں اور رنگوں سے سجی کائنات وجود میں آئی۔ اس کا خالق کون ہے اور خالق کا اس کائنات کو پیدا کرنے کا مقصد کیا ہے؟ وہ کون ہے جو اس عظیم کارخانے کو اس قدر منظّم انداز سے حرکت دے رہا ہے کہ نہ چاند سورج سے ٹکراتا ہے، نہ زمین چاند سے۔ مگر سائنس کے پاس نہ اس کا جواب کل تھا نہ آج ہے۔ تاہم یہ بات ذہن میں رہے کہ علم سائنس بذات خود ایک انتہائی اعلیٰ علم ہے جس نے انسان کو خالق کی طرف راغب کیا ہے نہ کہ خالق سے دور۔

مگر بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ سائنس اور فلسفہ کے پیچھے کام کرنے والے دماغ ایسے ادوار میں پیدا ہوئے جب انسانیت کلیسا کے نظام جبر کے تحت سسک رہی تھی۔ چنانچہ سترہویں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ان علوم میں مہارت حاصل کرنے والے لوگ طبعاً مذہب بیزار تھے اس لیے انھوں نے کبھی تو عمداً اور کبھی سہواً ایسے نظریات پیش کیے کہ لوگ کسی خالق کے وجود سے ایک فاصلے پہ رہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ کائنات کے اس حیرت انگیز اسلوبِ روانی کو بھی محض ایک اتفاق قرار دے کر اپنی جان چھڑانا چاہتے ہیں کہ کہیں پھر

سے وہ اس مذہبی نظام جبر کے تحت نہ آ جائیں جو صدیوں علم کی راہ میں حائل رہا اور جس نے کبھی آزادانہ علم و تحقیق کی روایت کو پروان نہ چڑھنے دیا۔ یہی خوف آج تک اہل مغرب کے تمام فلاسفہ کے ذہن کے کسی گوشے میں موجود ہے جو ان کو حقیقت سے آنکھیں چرانے پہ مجبور کیے ہوئے ہے۔ مگر انشااللہ وہ دن دور نہیں جب خود اہل مغرب کے صاحبِ دانش قرآن کو کسی تعصب کے بغیر پڑھیں گے تو اُن کی آنکھوں سے صدیوں کے پڑے ہوئے پردے ہٹیں گے جو کلیسا کے جبر نے ان کی آنکھوں پہ باندھ رکھے ہیں۔

اب ہم پھر اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں کہ کائنات کی محض کسی اتفاق کے سہارے وجود میں آ جانے کی توجیہ اس بات میں مانع ہے کہ کسی کو اس کائنات کا خالق قرار دیا جا سکے۔ کیونکہ یہ توجیہ عین اپنی ساخت کے اعتبار سے دو خدا چاہتی ہے۔ حرکت اول کی توجیہ کے لیے تو اتفاق کا نام لیا جا سکتا ہے مگر اس کے بعد مسلسل حرکت کو کسی بھی حال میں اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی توجیہ کے لیے لامحالہ ایک دوسرا خدا تلاش کرنا پڑے گا چنانچہ اسی مشکل کو حل کرنے کے لیے انھوں نے اصول تعلیل (Principle of causation) پیش کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ حرکت اول کے بعد کائنات میں علت اور معلول کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے کہ ایک کے بعد ایک واقعات پیش آتے چلے جاتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے بچے بہت سی اینٹیں کھڑی کر کے کنارے کی ایک اینٹ گرا دیتے ہیں تو اس کے بعد کی تمام اینٹیں خود بخود گرتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے مطابق جو واقعہ ظہور میں آتا ہے اس کا سبب کائنات کے باہر کہیں موجود نہیں ہے بلکہ نا قابل تسخیر قوانین کے تحت حالات ما قبل کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے اور یہ سابقہ حالات بھی اپنے سے پہلے واقعات کا لازمی نتیجہ تھے اس طرح کائنات میں علت اور معلول کا ایک لامتناعی سلسلہ قائم ہو گیا جو اپنی ارتقائی منازل طے کرتا رہا حتیٰ کہ تاریخ عالم کا آغاز ہو گیا۔ چنانچہ ان اہل دانش نے کہا کہ تاریخ عالم کے آغاز نے آئندہ پیش آنے والے واقعات کا قطعی فیصلہ کر دیا۔ یعنی جب ابتدائی صورت ایک دفعہ متعین ہو گئی تو قدرت صرف ایک طریق سے منزل مقصود کو پہنچ سکتی تھی گویا ان کے اس تصور کے مطابق جس روز کائنات صاحب وجود ہوئی اس کی آئندہ تاریخ بھی اسی دن متعین ہو چکی تھی۔

اس اصول کو قدرت کا اساسی اصول مقرر کرنا سترہویں صدی کا ایک بڑا واقعہ تھا جس کے نتیجے میں ایک نیا فلسفہ منظر عام پہ آیا اور سائنس دانوں نے زمین اور تمام نظام کائنات کو مشین قرار دینے کا تہیہ کر لیا۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں کائنات کو مشین ثابت کرنے کا تصور عروّج پہ پہنچ گیا۔ یہ اس لیے بھی ہوا کہ یہ زمانہ انجینئر سائنس دانوں کا زمانہ تھا جن کی دلی خواہش تھی کہ کائنات کے مشینی ماڈل بنائیں جائیں۔ چنانچہ اس

زمانے کے معروف سائنس دان اور انجینئر (Helm Holtes) نے کہا تھا کہ تمام قدرتی سائنسوں کا آخری مقصد اپنے آپ کو میکینکس میں منتقل کر لینا ہے۔ اگر چہ اس اصول کے مطابق کائنات کے تمام مظاہر کی تشریح کرنے میں ابھی سائنس دانوں کو کافی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ مگر ان کو یقین تھا کہ کائنات کی تشریح میکانکی پیرائے میں کرنی ممکن ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ صرف تھوڑی سی کوشش کی ضرورت ہے اور بالآخر وہ اس تمام کائنات کو ایک چلتی پھرتی مشین ثابت کر کے رہیں گے۔ ان باتوں کا انسانی زندگی سے تعلق صاف ظاہر تھا کہ اصول تعلیل کی ہر توسیع اور قدرت کی ہر کامیاب میکانکی تشریح نے انسانیت پر یقین کرنا محال بنا دیا۔ اس نظریے نے ایک اور بڑے سوال کو جنم دیا کہ اگر یہ اصول تمام قدرت پر حاوی ہے تو زندگی کو اس سے کیوں کر مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس طرز فکر کے نتیجے میں سترویں اور اٹھارویں صدی میں کئی میکانکی فلسفے وجود میں آئے جنہوں نے انسانی فکر پہ دور رس اثرات چھوڑے۔

پھر جب یہ دریافت ہوا کہ جاندار خلیہ (Living Cell) بھی بے جان مادہ کی طرح محض کیمیائی جوہروں سے بنا ہے تو فوراً یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ خاص اجزاء جن سے ہمارے یہ جسم و دماغ بنے ہیں کیوں کر اصول تعلیل کے دائرے سے باہر ہو سکتے ہیں۔ تو وقت کے سائنس دانوں نے یہ گمان کیا بلکہ دعویٰ کیا کہ زندگی بھی تو ایک مشین ہی کی طرح ہے اور اس کی بھی میکانکی تشریح ممکن ہے۔ بعض لوگوں کے دماغوں پہ اس میکانکی نظریے کا اتنا غلبہ تھا کہ انھوں نے برملا اعلان کر دیا کہ نیوٹن، باخ اور مائیکل اینجلو کے دماغ کسی پرنٹنگ مشین سے صرف پیچیدگی میں مختلف ہیں ورنہ ان کا کام صرف یہ تھا کہ وہ بیرونی محرکات کا مکمل جواب دیں۔

یہ الگ قصہ ہے کہ کائنات کی میکانکی تشریح کے پیرو اچانک ہی تاریخ کی راہداریوں میں کہیں گم ہو کے رہ گئے اور آج کی جدید سائنس ان کا صرف مذاق اڑاتی ہے۔ آج کی سائنس اس سخت اور غیر معتدل قسم کے اصول علیت کی اب قطعاً قائل نہیں اور جدید تحقیق کی روشنی میں نظریہ اضافت کے اصول وضع کیے گئے اور نظریہ اضافت کے پیرو اب اصول تعلیل کو دھوکے (Elusion) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں ہی سائنس پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ کائنات کے بہت سے مظاہر بالخصوص روشنی اور کشش ثقل کی قوت میکانکی تشریح کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتے ہیں اس دور میں جب یہ بحث ابھی جاری تھی کہ کیا واقعتاً ایسی مشین تیار کی جا سکتی ہے جو نیوٹن کے افکار باخ کے جذبات اور مائیکل اینجلو کے خیالات کا اعادہ کر سکے مگر سائنس نے اس ضمن میں مکمل خاموشی اختیار کر لی اور ان تصورات کو کوئی عملی شکل نہ دی جا سکی۔ سائنس جو

ہمیشہ سے عمل ارتقاء کی جانب رواں دواں رہی ہے اور اس کے آج کے نظریات کل کا مذاق بن کے رہ جاتے رہے ہیں اس نتیجے کے قریب تھی کہ کائنات کی میکانکی تشریح کے باب کو اب بند کر دیا جانا چاہیے اس لیے کہ سائنس دانوں کو اس بات کا یقین حاصل ہو چکا تھا کہ کوئی مشین شمع کی روشنی اور سیب گرنے کے واقعہ کو محسوس نہیں کر سکتی چاہے اس مشین پہ منوں سیب گرتے رہیں یا اس کے سامنے سینکڑوں شمعیں روشن کر دی جائیں۔ پھر اس قدیم سائنسی نظریے کو بھی خود اپنے ہی گھر سے ہزیمت اٹھانا پڑی جس میں بڑے وثوق سے اہل فلسفہ نے اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی ہے جو روز اول سے علت اور معلول کی مسلسل کڑی کے مطابق ابد تک کے لیے متعین ہو چکا ہے۔ مگر بالآخر سائنس کو خود یہ بات تسلیم کرنی پڑی کہ کائنات کا ماضی اس قدر اٹل طور پہ اس کے مستقبل کا سبب نہیں بن سکتا جیسا کہ پہلے پہل خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ موجودہ معلومات کی روشنی میں سائنس دانوں کی ایک بڑی اکثریت کا اب اس بات پہ اتفاق ہے کہ علم کا دریا ہمیں ایک غیر میکانکی حقیقت (Non Mechanical Reality) کی طرف لیے جا رہا ہے۔ کائنات کی پیدائش اور اس کی حرکت کے بارے میں سائنس کے یہ دونوں نظریات جو سائنسی ترقیوں کے ساتھ وجود میں آئے تھے اب تک یقین کی دولت سے محروم ہیں۔ جدید تحقیقات ان کی بنیاد کو مضبوط نہیں بناتی بلکہ اور کمزور کرتی ہے۔ اس طرح گویا سائنس خود ہی اپنے اس تاریخی نظریہ کی تردید کر رہی ہے اور اب انسان دوبارہ پھر اسی منزل پہ پہنچ گیا ہے جس کو چھوڑ کر اس نے اپنا یہ سفر شروع کیا تھا۔

یاد رہے کہ ابتداء میں انسان کائنات کے ارتقاء کے پیچھے کسی مافوق الفطرت قوت کا یا بہت سی قوتوں کا تصور رکھتا تھا۔ مختلف زمانوں کے سائنس دانوں اور اہل فلسفہ کی آرا پہ اس تنقید سے ایک زبردست فکری مغالطے کے لاحق ہو جانے کا خطرہ بھی موجود ہے جس کا ابطال ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر سائنس دان اور ہر فلسفی کائنات کی اس توجیہ کا قائل ہو جس کی تفصیلات مندرجہ بالا مباحث میں پیش کی گئیں حقیقت یہ ہے کہ سینکڑوں سائنس دان اور فلاسفہ کائنات کی حقیقی ماہیت پہ غور و فکر کے بعد اس حقیقی نظریہ تک پہنچ گئے تھے جس کا اعلان پہلے ہی قرآن میں ابدی صداقت کی حیثیت سے کر دیا گیا تھا۔ اہل فلسفہ کا پورا ایک گروہ خالق کے وجود کا نہ صرف اقرار کرتا تھا بلکہ وہ کائنات کے ہر معاملے میں اس کو دخیل بھی تصور کرتا تھا۔ سقراط افلاطون اور ارسطو جیسے بڑے یونانی فلاسفہ نہ صرف خدا کی ذات پہ یقین رکھتے تھے بلکہ وہ نظریہ توحید کے بھی قائل تھے۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنے فکر و تدبر کی بنا پہ یہ بات جان لی تھی کہ نظام کائنات کے نظم کے اندر جو بے مثال ہم آہنگی پائی جاتی ہے وہ اس بات کا ثبوت مہیا کرتی ہے کہ اس کے پیچھے صرف ایک ہی قوت امر کار

فرما ہے ورنہ صورت حال بہت ابتر ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ خالق کائنات کے وجود سے عاری مندرجہ بالا فلسفیوں کے افکار کے متوازی کئی دیگر آراء بھی اپنی علمی حیثیت میں قابل بحث تھیں بلکہ وہ حقیقت سے اس لیے قدرے قریب تھیں کہ فلاسفہ کا یہ گروہ کائنات کی توجیہ کسی اتفاق سے نہیں کرتا بلکہ وہ اس سارے نظام کائنات کے پیچھے ایک قوت قاہرہ پہ یقین رکھتا تھا۔ چنانچہ بعض فلسفیوں نے یہ خیال پیش کیا کہ خدا اگرچہ کوئی متشخص ذات نہیں مگر وہ کائنات کی اس رنگا رنگی کے عقب میں قوت محرکہ (Motive Force) یا بالفاظ دیگر علت العلل (Causes of Cause) ہے۔ تاہم بنیادی طور پہ یہ خیال فلسفیوں کا نہیں بلکہ سائنسدانوں کا تھا اس لیے میرے نزدیک ان کی رائے منطقی نہیں ہے اس لیے کہ ان کا ذہن مشینی ہوتا ہے یہ لوگ جذبات سے بھی عاری ہوتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ عقل کے دائرے میں ان کا قبلہ صرف ایک ہی ہوتا ہے یعنی مادی وجود جس کے باہر وہ کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتے۔

فلسفے میں اگر اس تصور کی کوئی بنیاد ہے تو وہ صرف (Seponziea) کے فلسفے میں ہے جس نے کہا تھا کہ خدا کا قانونِ قدرت ایک بڑی مشین یا قوت محرکہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ خدا کو قوت محرکہ یا علت العلل مان لینے سے انسان کا کون سا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ اس کی کون سی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ انسان کو تو ایسے خدا کی ضرورت ہے جو اس کی نیازمندیوں، اس کی دعاؤں، اس کی محبتوں اور اس کی التجاؤں کا مرکز ومحور ہو۔ وہ جب چاہے اس کو پکار سکے اس کے آگے فریاد کر سکے اور انسان جہاں بھی جس حال میں بھی ہو خالق اس کی فریاد کو سن سکے۔ انسان کو یہ توقع ہو یہ یقین ہو کہ میں جہاں سے پکاروں گا میرا خالق میری آواز سنے گا۔ اور خالق جو بھی کرنا چاہے کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ چنانچہ یہ سب ہماری فطرت کا حصہ ہے کہ ہم ایک ایسی ہی صفات والے معبود کے محتاج ہیں اور مجرد ایک قوت محرکہ یا مجرد قوانین قدرت سے انسان کو کیا حاصل ہوگا؟ کسی مشین کے آگے سجدہ کر کے انسان کو کیا روحانی تسکین حاصل ہوگی اور خدا اگر انجن کے اندر بھاپ کی طرح ہے تو اس کے آگے فریاد کرنے کا کیا فائدہ ہوگا؟ وہ اپنا کام کرے گا یا ہماری فریاد سنے گا؟ اس ضمن میں دوسرا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خالق کائنات کو قوت محرکہ یا قوانین فطرت مان لینے سے کائنات کی توجیہ نہیں بن پاتی۔

مثال کے طور پہ کوئی شخص کسی کار کو دیکھ کے یہ دعویٰ کرے کہ میں اس کی حرکت کے راز کو پا گیا ہوں یہ پیٹرول سے چلتی ہے۔ تو یہ دعویٰ کار کی اصل حقیقت کا عشر عشیر بھی نہیں۔ سوال صرف کار کے چلنے کا نہیں بلکہ کار کے اندر ایک عظیم سائنسی نظام میں پوشیدہ ہے اس کے اندر حسن و جمال ہے۔ اس کی افادیت ہے اس کا ایک

پیچیدہ مکینیکل نظام ہے اور ہزاروں پرزے ہیں جو اس کار کو چلانے میں اپنا اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ان تمام چیزوں کی توجیہ یہ مان لینے سے تو نہیں ہو سکتی کہ کار پیٹرول سے چلتی ہے۔ پیٹرول تو محض کار کی حرکت کا باعث ہوتا ہے۔یہ ایک اندھی بہری قوت انجن کو مہیا کر دیتا ہے جس کو کنٹرول کر کے مفید مصرف میں لانے کے لیے بھی کار کے انجن کی ساخت کو دخل ہے۔پس ثابت یہ ہوا کہ حرکت کی علت جان لینے سے اگر ایک کار کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا تو کسی قوت محرکہ کے وجود کو تسلیم کر لینے سے اس پورے عالم کائنات کی توجیہ کیسے ممکن ہے؟ حقیقت یہ ہے مذہب یا الہام سے دامن چھڑا کے کائنات کی حقیقی توجیہ ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ اس حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں جو نظام ربوبیت قائم ہے جو عظیم قدرت جو عظیم حکمت جو عظیم صناعی نظر آتی ہے قدم قدم پہ خالق کی رحمانیت کے جو مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں کیا ان سب کی توجیہ ایک قوت محرکہ کے تصور سے ہو سکتی ہے؟ کبھی نہیں ذرا اور غور کریں کہ اس کائنات کے تمام چھوٹے بڑے عناصر ہر لمحہ اور دن رات انسانوں کی پرورش کے سامان کی فراہمی میں مگن ہیں۔چاند بھی اسی لیے مصروف کار ہے، ہوا بھی ہر آن اسی کے لیے گردش کر رہی ہے، پرورش اور تربیت کا یہ تمام اہتمام ہماری زندگی کے ہر گوشے میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ظاہر کی بھی پرورش ہو رہی ہے اور باطن کی بھی۔ہمارا جسم بھی پل رہا ہے اور ہمارا باطن بھی زیر تربیت ہے۔ہماری عقل کو بھی غذا مل رہی ہے، ہماری روحانی صلاحیتوں کو بھی بالیدگی عطا کی جارہی ہے۔ ہمارے لیے ہی زمین کا یہ فرش بچھایا گیا ہے اور آسمان کا شامیانہ تانا گیا ہے۔سورج اور چاند چمک رہے ہیں ابر و ہوا ہماری خدمت میں سرگرم ہیں کیا اس سارے اہتمام کی توجیہ کسی قوت محرکہ سے کی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ اس کے پیچھے کسی رحم والی بردبار ہستی کا تصور ہی قابل قبول فلسفہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اب اس بات کو مانے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کہ کوئی رحیم و کریم، علیم و خبیر ، سمیع و بصیر اور حکمت و تدبر سے بھر پور ذات ہے جو اس سارے اہتمام کے عقب میں موجود ہے اور اگر بقول فلاسفہ یہ صفات ان کی کسی قوت محرکہ میں ہی موجود ہیں جو کائنات کا نظام و انصرام سنبھالے ہوئے ہے تو پھر اسے محض ایک قوت کا نام کیوں دیا جائے کیوں نہ اسے اللہ کہا جائے جو بہت عمدہ نام ہے اور کائنات کی توجیہ کے لیے بھی موزوں محسوس ہوتا ہے۔ جہاں تک اہل فلسفہ کا خدا کی ذات کے متعلق عمومی تصور ہے تو ان کی عظیم اکثریت شروع سے لے کر آخر تک یہ مانتی چلی آئی ہے کہ خدا ہے۔ ماضی کے تمام بڑے فلاسفر یہی رائے رکھتے تھے حد یہ کہ ''ہیوم جیسا ارتیابی'' فلاسفر بھی خدا کی ضرورت کا قائل نظر آتا ہے اور اسی کی ذات پہ فلسفہ زندگی کی بنیاد رکھتا ہے۔ تاہم فلاسفہ کا ایک گروہ کسی خالق کے وجود سے ہمیشہ سے انکاری رہا ہے میرے نزدیک صرف وہ فلاسفر خدا کے

وجود سے انکاری ہیں جنہوں نے بحیثیت مجموعی زندگی کا فلسفہ پیش نہیں کیا بلکہ محض کسی ضمنی چیز کو اتنی اہمیت دے دی ہے کہ وہ ان کے نزدیک پوری زندگی پہ حاوی ہوگئی ہے۔ مثلاً بعض لوگ نظریہ ارتقاء کو خدا کا بدل قرار دیتے رہے ہیں فرائیڈ نے فرج کو اور مارکس نے بطن کو اپنے فلسفہ کا محور بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل فلاسفہ کا ایک گروہ بھی اس طبقہ فکر کو فلسفی تسلیم کرنے سے انکاری ہیں اس لیے کہ ان کے خیال میں زندگی کے کسی ایک پہلو پہ بات کرنے کو فلسفہ کا موضوع ہی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

چنانچہ اہل فلسفہ کی اکثریت کے ہاں خالق کے وجود کے بارے میں اثباتی رائے پائی جاتی ہے اور تمام اصل فلسفی خدا کو مانتے ہیں اور اس طرح مانتے ہیں جس سے انسانی زندگی کے ساتھ اس کا تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

جہاں تک بعض مفکرین کے اس خیال کا تعلق ہے کہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے خدا کے مسئلے کو حل کر دیا ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا میں ارتقاء ہوا ہے اور زندگی پانی، گندے کیچڑ، خشک مٹی اور کہاں کہاں سے ہوتی ہوئی موجودہ حالت کو پہنچی ہے اور مٹی کے ایک لوندے سے اتنی شکلیں بن گئی ہیں۔ زندگی جو کبھی رینگنے والے جانوروں کی شکلوں میں چھپی ہوئی تھی اس سے درجہ بدرجہ ترقی کر کے انسان کے احسن تقویم میں بے نقاب ہوئی اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈارون نے اور زیادہ سنجیدگی سے خدا کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس کائنات کو اتنا بے رنگ نہ سمجھو یہ ایک مدبر کی قوت کا کرشمہ ہو سکتا ہے کہ وہ مٹی سے گوناں گوں اشکال اور ایک عاقل و فرزانہ انسان بھی پیدا کر سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ارتقاء کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہوتا ہی رہتا مگر کیا ہوا کہ آخر اس عمل ارتقاء کو ایک حد پہ جا کے روک دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی ایک ہی توجیہ ممکن ہو سکتی ہے کہ ایک مدبر ذات نے اس کو ایک حد تک جانے کے بعد روک دیا ہے۔ ایک اور قابل غور امر یہ ہے کہ آخر مرد اور عورت کا بھی تو ارتقاء ہوا ہے لیکن ان دونوں میں اتنی سازگاری کس طرح پیدا ہوگئی کہ ایک کے بغیر دوسرا نامکمل رہتا ہے اور دونوں مل کر ہی کائنات کے ایک عظیم مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے سنجیدہ امور کو کسی بھی سطح پہ اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس کے پیچھے کسی مدبر اور حکیم وقدیر ذات ہی کا تصور پنپ سکتا ہے جس نے یہ سب کچھ کیا اور یہ تمام کرشمے کسی اندھی بہری قوت محرکہ کے نہیں ہو سکتے۔

فلاسفہ کے ایک اور مذہب بیزار گروہ نے یہ ہوائی اڑائی کہ خدا انسانی عقل سے بالاتر ہے جس سے یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ کیا انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ چونکہ بیشتر فلسفیوں کی رائے کے مطابق خدا موجود ہے یا خدا کی ضرورت موجود ہے یا انسان خدا کو ماننے پر خود کو مجبور پاتا ہے لیکن ان کے خیال میں خدا کی صفات اور اس کی معرفت حاصل کرنا عقل انسانی سے بعید ہے۔ مثلاً فرانسس بیکن نے کہا کہ ہم عقل

کے ذریعے خدا کو ماننے پر مجبور ہیں مگر اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ تھامس ہوبس اور ڈیوڈ ہیوم کہتے ہیں کہ ہم عقل کے ذریعے صرف اتنا جان سکے ہیں کہ خدا ہے جو اپنی کائنات کا نظام چلا رہا ہے مگر ہم اس کی ذات کے متعلق کچھ بھی نہیں جان سکے۔ البتہ ڈیکارٹ نے کہا کہ عقل کے ذریعے خدا کی بہت سی صفات اور تقاضوں کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ عقل کی نارسائی کا یہ نوحہ بھی طرفہ تماشا نظر آتا ہے اس لیے کہ ایک طرف تو انسان کی عقل کا یہ حال ہے کہ اگر اسے موہنجوداڑو ہڑپہ یا مصر کے اہراموں کی ریت سے کوئی ٹوٹا ہوا مرتبان مل جائے تو اس پہ موجود چند آڑی ترچھی لکیروں کی مدد سے وہ گذرے وقت کی تہذیب، وقت کا فلسفہ، وقت کا کلچر اور ثقافت تک دریافت کر لیتا ہے۔ اسی طرح اسے کہیں سے کوئی ٹوٹی ہڈی یا جبڑا مل جائے تو وہ قدیم انسان کی ساخت اس کی بودوباش اور اس کی عمر تک معلوم کر لیتا ہے لیکن دوسری طرف اس کی عقل کی رسائی کا یہ عالم ہے کہ یہ پورا صحیفہ کائنات اس کے سامنے ہے جس میں آسمان ہے، زمین ہے، سمندر ہیں، پہاڑ ہیں ستارے ہیں، سورج ہے، چاند ہے، کہکشائیں ہیں، قوموں کے عزل ونسب کے لیے خدائی قوانین ہیں۔ حیرت ہے کہ اس سارے اہتمام سے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان صرف اپنے گرد و پیش کی اشیاء پر ہی غور کرے تو خدا کی سینکڑوں صفات اور تقاضوں کو جان سکتا ہے۔ انسان کو اپنی بھوک مٹانے کے لیے چاروں طرف انواع واقسام کی اجناس غلے، سبزیاں، ترکاریاں، گوشت، پھل میوے اور مشروبات نظر آتے ہیں تو کیا یہ خدا کی رحمت اور اس کی ربوبیت کو ظاہر نہیں کرتے۔ سورج کی گرمی اور اس کی روشنی کیا خالق کی قدرت اور حکمت کو ظاہر نہیں کرتے۔ یہ بے ستون آسمان اور اس پہ جگمگاتے ستارے خدا کی عظیم صناعی اور اس کے حسن و جمال کو ظاہر نہیں کرتے۔ رحم کی تاریکیوں کے اندر اللہ تعالیٰ کا موئے قلم جس طرح بچے کی نوک پلک سنوارتا ہے کیا اس سے اس کی صفتِ تخلیق کا اظہار نہیں ہوتا۔ چنانچہ خدا کی صفات کا علم حاصل کرنے کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان صحیفہ آسمانی کو کھلی آنکھوں کے ساتھ پڑھے اور اس کے تقاضوں کو سمجھے البتہ یہ ضرور ہے کہ خدا کو سمجھنے کا بھی ایک دائرہ ہے اور نہ سمجھنے کا بھی ایک دائرہ ہے۔ نہ سمجھنے کا دائرہ یہ ہے کہ ہم خدا کی ذات کی کھوج میں لگ جائیں کہ خدا کس چیز کا بنا ہوا ہے، اس کی ذات کیسی ہے، اس کی شکل کیسی ہے، وہ کس طرح سے اٹھتا اور بیٹھتا ہے اور کس طرح سے بات کرتا ہے؟ اس طرح کے تمام سوالات انسان کی ذہنی استعداد سے باہر ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس طرح کے معاملات کی کھوج میں انسانیت کی فلاح کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ ہمیں تو یہ جاننا ہے کہ ہمارے خالق کی مرضی کیا ہے؟ آخر اتنی بڑی کائنات یونہی بے مصرف تو پیدا نہیں کر دی گئی بلکہ

جتنی یہ کائنات ارفع و اعلیٰ ہے یقیناً اس کے مقاصد بھی اسی نسبت سے ارفع اور بلند ہونگے۔ چنانچہ تلاش کرنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے خالق کی مرضی کیا ہے؟ اس کے احکام کیا ہیں؟ اس کی پسند و ناپسند کیا ہے؟ اور اس کا انسان سے بنیادی مطالبہ کیا ہے؟ اور اس کے احکام اور منشا کیا ہے؟ جن کے تحت زندگی بسر کر کے ہم اس کی رضا حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر سلسلہ نبوت بھی اللہ کے انسانوں پہ احسان ہی کا تسلسل ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ تمام مظاہر قدرت ہماری مادی ضروریات کو بہ احسن پورا کر رہے ہیں مگر یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ خالق انسان کی روحانی تشنگی سے آشنا نہ ہو اور اس نے اس بات کا اہتمام نہ کیا ہو۔ مورخین لکھتے ہیں کہ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر انسان کی راہنمائی کے لیے جدوجہد کرتے رہے اور انسان تک اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے تاکہ وہ صرف مادی الجھاوے میں ہی اپنی زندگی نہ گزار دے بلکہ اس کے تاج شرف کا تقاضا ہے کہ وہ اللہ کی اس آواز پہ کان دھرے جو صرف اس کی فلاح کے لیے لگائی جا رہی ہے۔ چنانچہ ابدی صداقتوں سے سجے اور انسان کی منزلوں کے روشن سنگ میل کی صورت تین سو پندرہ آسمانی صحیفوں سے انسان کی راہنمائی کا اہتمام کیا گیا۔ انسان جب اپنے شعوری ارتقاء میں ایک خاص مقام پہ پہنچا تو اسے قرآن عطا کیا گیا جو رسول عربی محمد رسول اللہ ﷺ پہ اتارا گیا اور آپ ﷺ نے اسے دنیا کے انسانوں تک پہنچا دیا جس نے روحانیت اور مادی تہذیب کے مابین وہ توافق فراہم کیا جس پہ چل کے انسان فلاح کی اس منزل کو حاصل کر سکتا ہے جو اگرچہ اس کا مقدر ہے مگر شیطان کے الجھاوے بھی اس راہ میں موجود ہیں جن سے دامن بچا کے چلنا ہی حقیقی دانش ہے ورنہ زمانہ قدیم کے فلاسفہ کی طرح اور الحاد سے بھرے آج کے متکبر سائنس دانوں کی طرح انسان اپنی منزل سے بھٹک کے رہ جاتا ہے اور اس کے حصے میں فقط پشیمانی آتی ہے۔

چنانچہ اس ساری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ اسرارِ کائنات ہوں یا خالق کی تلاش کا سفر حقیقت کا کوئی سرا اس وقت تک انسان کے ہاتھ نہیں آ سکتا جب تک وہ علم وحی سے استفادہ نہیں کرتا کہ اگر کائنات کے خالق کے تصور کو قبول کر لیا جائے جو اصل حقیقت ہے اور آج کی جدید سائنس نے بھی جس کی تائید کر دی ہے تو پھر اسرارِ کائنات بھی فلسفہ کی پیچیدہ راہداریوں اور سائنس کے متزلزل نظریات میں کھو جنے کے بجائے اس اللہ کی تعلیمات میں ہی ملیں گے۔ قرآن میں ہی ملیں گے جہاں علم ہے، تیقّن ہے، روشنی ہے، راہنمائی ہے، فلاح ہے، سکون ہے، آسودگی ہے، گہرائی ہے، ابدیت ہے، عبرت ہے، قانون ہے، تاریخ ہے، ڈر ہے، دستور ہے، خوشخبری ہے، ماضی ہے، حال ہے، مستقبل ہے، جنت ہے، دوزخ ہے، برزخ ہے، زمین ہے، آسمان

ہے،ستارے ہیں،کائنات ہے،نصیحت ہے،تاکید ہے،ذکر ہے،سلامتی ہے،عشق ہے،خرد ہے جنوں ہے دانش ہے،امن ہے،محرک ہے،نسبت ہے،پہچان ہے،دید ہے،شنید ہے،روحانیت ہے،حسن و جمال ہے کمال خیال ہے،فطرت ہے،عدالت ہے،شہادت ہے،مسیحائی ہے،دلربائی ہے،اشک روائی ہے،کبریائی ہے،دانائی ہے،شفقت ہے،قدرت ہے،رحمت ہے،قہر ہے،خبر ہے۔چنانچہ قرآن کے اندازِ بیان سے ہی ظاہر ہے کہ وہ ایک ایسی ذات کی طرف سے ہے جو تمام اعلیٰ صفات رحم،قدرت،عنایت،مہربانی،شفقت خبر،سمع اور علم اور ابدیت کا حامل ہے جیسا کہ فرمایا گیا:

اللّٰهُ لَا إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لاَ تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلاَ نَوْمٌ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الأَرْضِ مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلاَّ بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلاَ يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلاَّ بِمَا شَاء وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضَ وَلاَ يَؤُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ○

(القرآن الحکیم سورۃ البقرۃ ۲۔۲۵۵)

ترجمہ:

''اللہ ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ ہے سب کا قائم رکھنے والا ہے،نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند،جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے،کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر وہ جو چاہے اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پہ حاوی ہے اور ان کی حفاظت اس پہ ذرا بھی گراں نہیں اور وہ بلند اور عظیم ہے''۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ:

هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ

الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ○ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ
الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ
الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ○ هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ
الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○

(القرآن الحکیم سورۃ الحشر ۵۹ آیات ۲۲۔۲۴)

ترجمہ:

’’وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں غائب و حاضر کا جاننے والا وہ رحمان و رحیم ہے وہی اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں بادشاہ، یکسر پاک، سراپا سکھ، امن بخش، معتمد، غالب زور آور، صاحبِ کبریاء، اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں وہی اللہ ہے، نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، اسی کے لیے ساری اچھی صفتیں ہیں اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ غالب و حکیم ہے‘‘۔



ابدیت کی تلاش

کائنات کے ایک وسیع پس منظر میں جب انسان شعوری ارتقاء کی اس منزل کو پہنچا جب اس نے اپنی ذات کے متعلق سوچنا شروع کیا تو اس کے سامنے بہت سے سوالات پھن اٹھائے کھڑے تھے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ اسے کہاں جانا ہے؟ وہ اپنے اندر بہت سے حوصلے اور تمنائیں پاتا ہے وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ان کی تسکین کس طرح ہوگی وہ اپنی اس زندگی سے مطمئن نہیں ہوتا وہ ابدیت چاہتا ہے۔ وہ خوشی میں جوانی میں اور نعمت میں اس تسلسل کا آرزومند ہے جو اسے احساسِ تشنگی سے دور لے جائے وہ اپنی موجودہ اور محدود زندگی کے مقابلے میں ایک طویل تر زندگی چاہتا ہے مگر نہیں جانتا کہ اس کو کہاں سے پائے گا۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے اندر پائے جانے والے بہت سے اخلاقی اور انسانی احساسات کو بری طرح پامال کیا جا رہا ہے۔ یہ سوال اسے ہر لمحہ تنگ کرتا ہے کہ کیا وہ کبھی اپنی پسندیدہ دنیا کو حاصل کر سکے گا یہ اور اس جیسے بے شمار سوال اس کے ذہن میں ابلتے رہتے ہیں اور کائنات کا مطالعہ کس طرح اس کے ذہن میں

یہ سوال پیدا کرتا ہے اس کو متعین کرنے کے لیے قدرے تفصیل سے کائنات کے ارتقائی مراحل پہ نظر ڈالنا ہو گی۔ چنانچہ ماہرین حیاتیات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انسان اپنی موجودہ شکل میں تین لاکھ برس سے زمین پر موجود ہے مگر اس کے مقابلے میں کائنات کی عمر بہت زیادہ ہے یعنی تقریباً دو لاکھ ارب سال (۲۰ نیل سال)اس سے قبل کائنات برقی ذرات کے ایک غبار کی شکل میں تھی پھر اس میں حرکت ہوئی اور مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہوا یہی جمع شدہ مادہ بعد میں ستاروں سیاروں اور سحابیوں کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ مادی ٹکڑے گیس کے مہیب گولوں کی شکل میں نامعلوم مدتوں تک فضا میں گردش کرتے رہے پھر تقریباً دو ارب سال پہلے ایسا ہوا کہ کائنات کا کوئی بڑا ستارہ فضاء میں سفر کرتا ہوا آفتاب کے قریب آ نکلا جو اس وقت بہت بڑا تھا اور جس طرح چاند کی کشش سے سمندروں میں اونچی اونچی لہریں اٹھتی ہیں اسی طرح اس دوسرے ستارے کی کشش سے سورج پہ ایک عظیم طوفان برپا ہو گیا جس سے زبردست لہریں پیدا ہوئیں جو رفتہ رفتہ نہایت بلند ہوتی چلی گئیں اور قبل اس کے کہ وہ ستارہ آفتاب سے دور ہٹنا شروع ہوا اس کی قوتِ کشش اتنی بڑھ گئی کہ آفتاب کی ان زبردست لہروں کے کچھ حصے ٹوٹ کر ایک جھٹکے کے ساتھ دور فضا میں بکھر گئے اور یہی ٹکڑے بعد میں ٹھنڈے ہو کر ہمارے نظام شمسی کے توابع بنے۔

اس وقت سے یہ ٹکڑے آفتاب ہی کے گرد گھوم رہے ہیں اور انھی میں سے ایک ہماری یہ زمین بھی ہے۔ زمین ابتدا میں ایک شعلے کی صورت سورج کے گرد گھوم رہی تھی مگر پھر فضا میں مسلسل حرارت خارج کرنے کی وجہ سے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی یہ عمل کروڑوں برس جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ بالکل سرد ہو گئی مگر سورج کی گرمی اب بھی اس پہ پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے بخارات اٹھنا شروع ہوئے اور گھٹاؤں کی شکل میں زمین کے اوپر چھا گئے پھر جب یہ بادل برسنا شروع ہوئے تو ساری زمین پانی سے بھر گئی۔ زمین کا اوپری حصہ اگرچہ ٹھنڈا تھا مگر اس کا اندرونی حصہ ابھی تک گرم تھا جس کے نتیجے میں زمین سمٹنے لگی اس کی وجہ سے زمین کے اندر کی گرم گیسوں پہ بھی دباؤ بڑھا اور وہ باہر نکلنے کے لیے بے تاب ہو گئیں اب تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد زمین پھٹنے لگی جگہ جگہ بڑے بڑے نشیب وجود میں آنے لگے اسی طرح بحری طوفانوں خوفناک زلزلوں اور آتش فشاں دھماکوں میں ہزاروں برس بیت گئے ان زلزلوں ہی کی وجہ سے زمین کا کچھ حصہ اوپر ابھر آیا اور بہت سا حصہ دب کے رہ گیا۔ تب دبے ہوئے حصوں میں طوفانی بارشوں کی وجہ سے پانی جمع ہو گیا اور یہ نشیب بھرتے سمندروں میں بدل گئے اور زمین کے ابھرے ہوئے حصوں نے براعظموں کی شکل اختیار کر لی۔ بعض اوقات یہ ابھار اس طرح واقع ہوئے کہ اونچی اونچی سی باڑیں بن گئیں یہ ہماری دنیا کے اولین پہاڑ

تھے۔ ماہرین ارضیات بیان کرتے ہیں کہ اب سے تقریباً ایک ارب تیئس کروڑ سال پہلے زمین پر زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ یہ چھوٹے چھوٹے کیڑے تھے جو پانی کے کناروں پر وجود میں آئے۔ اس کے بعد بھی لاکھوں سال تک مختلف قسم کے جانور پیدا ہوتے اور مرتے رہے۔ ابتداً کئی ہزار سال تک زمین پر صرف جانور ہی رہے۔ پھر اس کے بعد سمندری پودے نمودار ہوئے اور خشکی پر بھی گھاس پھونس اگنا شروع ہوئی۔ اسی طرح ایک لمبی مدت تک بے شمار واقعات ظہور میں آتے رہے یہاں تک کہ زمین کے حالات انسانی زندگی کے لیے سازگار ہوئے اور زمین پر انسان پیدا ہوا۔ اس نظریہ کے مطابق زمین پہ انسان کی ابتدا تین لاکھ سال قبل ہوئی۔ یہ مدت بہت ہی کم ہے۔ وقت کے جو فاصلے کائنات نے طے کئے ہیں ان کے مقابلے میں انسانی تاریخ چشم زدن سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ پھر اگر انسانیت کی اکائی کو لیجیے تو معلوم ہوگا کہ ایک انسان کی عمر کا اوسط سو سال سے بھی کم ہے۔ ایک طرف اگر اس واقعہ کو سامنے رکھا جائے اور دوسری طرف یہ حقیقت بھی کسی بحث سے مبرا ہے کہ کائنات میں انسان سے بہتر کوئی وجود معلوم نہیں کیا جا سکا اور زمین و آسمان کی اربوں کھربوں سال کی گردش کے بعد جو بہترین مخلوق اس کائنات کے اندر وجود میں آئی ہے وہ انسان ہے۔

مگر حیرت انگیز امر یہ ہے کہ انسان جو ساری دنیا پہ فوقیت رکھتا ہے جو تمام موجودات میں سب سے افضل ہے اس کی زندگی چند سال سے زیادہ نہیں۔ ہمارا وجود جن مادی اجزاء سے مرکب ہے ان کی عمر تو اربوں کھربوں سال ہو اور وہ انسان کے مرنے کے بعد بھی باقی رہ جائیں مگر ان مادی اجزاء کی یکجائی سے جو اعلیٰ ترین وجود بنتا ہے اس کی عمر سو برس سے بھی کم ہے۔ جو وجودِ کائنات کا حاصل ہے اس کی عمر کی کائنات سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے اور تاریخ کے طویل ترین دور میں بے شمار واقعات کیا اس لیے جمع ہوئے تھے کہ ایک انسان کو چند دن کے لیے پیدا کر کے ختم ہو جائیں۔ زمین پر آج جتنے انسان پائے جاتے ہیں اگر ان میں سے ہر آدمی کا قد چھ فٹ ہو وہ ڈھائی فٹ چوڑا اور ایک فٹ موٹا ہو تو اس پوری انسانی آبادی کو با آسانی ایک ایسے صندوق میں بند کیا جا سکتا ہے جو ایک میل لمبا ایک میل چوڑا اور ایک میل اونچا ہو۔ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہی ہے پھر اگر اس صندوق کو کسی سمندر کے کنارے لے جا کے ایک ہلکا سا دھکا دیں تو وہ صندوق پانی کی گہرائی میں جا گرے گا صدیاں گذر جائیں گی مگر نسل انسانی اپنے کفن میں لپٹی ہوئی سمندر کی گہرائی میں پڑی رہے گی۔ اور دنیا کے ذہن سے بھی یہ محو ہو جائے گا کہ یہاں کبھی کوئی انسان نامی مخلوق بھی آباد تھی سمندر کی سطح پر اسی طرح بدستور طوفان آتے رہیں گے، ہوائیں یونہی چلتی رہیں گی موسم یونہی بدلتے رہیں

گے، سورج اسی طرح چمکتا رہے گا اور کرہ ارض بدستور اپنے محور کے گرد چکر لگا تا رہے گا، کائنات کی لامحدود پہنائیوں میں پھیلی ہوئی بے شمار دنیائیں اتنے بڑے حادثے کو ایک معمولی واقعہ سے زیادہ اہمیت نہ دیں گی۔ کئی صدیوں بعد ایک اونچا سا مٹی کا ڈھیر زبان حال سے بتائے گا کہ یہ نسل انسانی کی قبر ہے جہاں وہ صدیوں قبل ایک چھوٹے سے صندوق میں دفن کی گئی تھی۔

کائنات کے اس وسیع تر اور رنگا رنگ تناظر میں سوچا جائے کہ کیا انسان کی بس اسی قدر قیمت ہے مادہ کو کوٹئے پیٹئے یا جلائیے کچھ بھی کیجیے وہ ختم نہ ہوگا بلکہ ہر حال میں اپنے وجود کو باقی رکھے گا۔ مگر انسان جو بہر حال مادہ سے برتر مخلوق ہے کیا اس کے لیے بقاء نہیں؟ یہ زندگی جو ساری کائنات کا خلاصہ ہے کیا وہ اتنی بے حقیقت ہے کہ آسانی کے ساتھ اس کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے اور کیا انسانی زندگی کا منتہیٰ بس یہی ہے کہ وہ کائنات میں اپنے چھوٹے سے مسکن میں چند دن کے لیے پیدا ہو اور پھر ہمیشہ کے لیے فنا ہو کے رہ جائے۔ تمام انسانی علم اور انسانی کامرانیوں کے سارے واقعات ہمارے ساتھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں اور کائنات کی ہماہمی اور رونق اسی طرح برقرار رہے۔ گویا نسل انسانی کی مظاہر کائنات کے نزدیک کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ چنانچہ انسان اس احساسِ گراں کا بوجھ ہر دم اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے کہ کیا یہی زندگی ہے مگر یہ تو ایک ایسی زندگی ہے جس میں ہماری امنگوں کی کبھی تکمیل نہ ہو سکے گی جہاں ہمارے ارادوں کو پل پل شکست کا سامنا ہے۔ جہاں ہماری جدوجہد کے نتائج شاذ ہی ہمارے تصوارتی تخیل پر پورا اترتے ہیں۔ انسان طبعی طور پر موت سے نفرت کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس کے ارادوں اس کے خوابوں کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ ہر انسان لامحدود مدت تک زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہ موت سے کبھی سمجھوتے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ عام حالات میں وہ دکھ اور اذیت کی زندگی کو بھی موت پر فوقیت دیتا ہے اور وہ ہر قیمت پر سانس کے اس تسلسل کو برقرار رکھنے کی سعی کرتا ہے مگر اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر شخص جانتا ہے کہ وہ ایسی زندگی سے محروم ہے جس میں دوام ہو، خوشی ہو، سکون ہو اگر چہ ہر کسی کی خواہش یہی ہے کہ وہ دکھ درد اور ہر قسم کی تکلیفوں سے محفوظ زندگی گذارے مگر حقیقت یہی ہے کہ کوئی بھی یہاں ایسی زندگی حاصل نہیں کر سکتا جس میں وہ اپنے حوصلوں کو ولولوں کو تکمیل کی آخری حد تک لے جا سکے۔

وہ اپنی ساری تمناؤں اپنے سارے خوابوں کی تعبیر عملی صورت میں یہاں دیکھنا چاہتا ہے مگر اس دنیا کی محدود زندگی اس کا راستہ روکے کھڑی ہے۔ اس لیے انسان جو کچھ چاہتا ہے یہ کائنات اس کے لیے بالکل ناسازگار معلوم ہوتی ہے اور وہ ہر چند قدم بعد ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کے مظاہر ہر دم انسانی

خوابوں کو توڑنے میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی زلزلہ کسی خطے میں تباہی مچا جاتا ہے تو کبھی سیلاب نسلوں کی نسلیں اجاڑ جاتے ہیں، کبھی وبائیں بستیاں انسانی وجود سے خالی کر دیتی ہیں تو کبھی آگ خاکِ نشیمن کو جھلس دیتی ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانی زندگی محض کسی غلطی سے ایک ایسی کائنات میں بھٹک رہی ہے جو دراصل اس کے لیے بنائی ہی نہ گئی تھی اور جو بظاہر زندگی اور اس کے متعلقات سے بالکل بے پرواہ ہے؟ کیا انسان کے تمام جذبات خیالات احساسات اور تمنائیں غیر حقیقی ہیں جن کا اس واقعی دنیا سے کوئی تعلق ہی نہیں؟ ہمارے تمام بہترین تخیلات کائنات کے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں اور ہمارے ذہن میں یونہی بلاجہ جنم لیتے رہتے ہیں اور وہ احساسات تصورات خیالات جن کو لے کر نسل انسانی ہزاروں سال سے پیدا ہو رہی ہے اور اپنے سینوں میں لیے ہوئے اسی حال میں دفن ہو جاتی ہے اور وہ انھیں حاصل نہ کر سکی کیا ان احساسات کی کوئی منزل نہیں؟

کیا وہ انسانوں کے ذہن میں بس یونہی پیدا ہو رہے ہیں جن کے لیے نہ تو ماضی میں کوئی بنیاد موجود ہے اور نہ مستقبل میں ان کا کوئی مقام ہے۔ حالانکہ ساری کائنات میں صرف انسان ہی ایک ایسا وجود ہے جو خواب دیکھتا ہے۔ جو منصوبے بناتا ہے۔ جو آنے والے کل سے امید کا دامن وابستہ کرتا ہے۔ یہ صرف انسان کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ اپنے کل کی بہتری کے لیے جہد و سعی کرتا ہے۔ وہ کل کے متعلق سوچتا ہے اور کل کا تصور ہی اس کی زندگی میں رنگ بھرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جانور مثلاً چیونٹیاں خوراک جمع کرتی ہیں یا بیا اپنی آئندہ نسل کے لیے گھونسلا بناتا ہے مگر وہ یہ سب غیر شعوری طور پر محض عادتاً کرتے ہیں اور اس میں ان کی وہ جبلت راہنمائی کرتی ہے جو روزِ اول سے ان کی سرشت میں شامل ہوتی ہے۔ ان کی عقل اس بات کا فیصلہ نہیں کرتی کہ انھیں کل کے لیے خوراک کا ذخیرہ جمع کرنا چاہیے تاکہ آنے والے کل کو ان کی ضروریات پوری ہو سکیں اور نہ ہی بیا اس لیے گھونسلا بناتا ہے کہ اسے رہائش کے لیے ایک جائے پناہ درکار ہوتی ہے جو اسے موسم کے شدائد سے محفوظ رکھے بلکہ وہ یہ سب عادتاً کرتا ہے نہ کہ ضرورتاً۔ انسان اور دوسری مخلوقات کا یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو دوسری تمام مخلوقات سے زندگی میں زیادہ پھلنا پھولنا چاہیے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی اوسط عمر تو کوّوں سے بھی کم ہے۔ جانوروں کی زندگی صرف آج کی زندگی ہے۔ وہ زندگی کا کوئی کل نہیں رکھتے۔ کیا اسی طرح انسانی زندگی کا بھی کوئی کل نہیں؟ مگر ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے اس لیے کہ فکرِ فردا کا جو تصور انسان کے ہاں پایا جاتا ہے اس کا صریح تقاضا ہے کہ انسان کی زندگی اس سے کہیں زیادہ بڑی ہو جتنی آج اسے حاصل ہے۔ انسان ''کل'' چاہتا ہے مگر اس کو صرف

" آج " دیا گیا ہے۔اسی طرح جب ہم اپنی سماجی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو ایک زبردست خلا کا احساس ہوتا ہے۔ایک طرف مادی دنیا ہے جو اپنی جگہ پہ بالکل مکمل نظر آتی ہے وہ ایک متعین قانون میں جکڑی ہوئی ہے اور اس کی ہر چیز اپنے راستے پہ چلی جارہی ہے نہ سورج چاند سے ٹکراتا ہے نہ چاند زمین سے۔نہ رات دن میں داخل ہوتی ہے نہ دن رات میں۔ادھر پہاڑ اپنی جگہ جمے کھڑے ہیں تو سمندر اپنی ذات میں گم رواں دواں ہیں۔بادل اپنے نظام الاوقات کے پابند ہیں تو ہوائیں بھی خالق کی منشا کے مطابق ہی چلتی اور رکتی ہیں۔یعنی دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ مادی دنیا ویسی ہی ہے جیسی کہ اسے ہونا چاہیے مگر انسانی دنیا کا حال اس سے مختلف ہے یہاں صورت حال اس کے برعکس ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔ہم صریح طور پہ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کرتا ہے اس کا حق غصب کرتا اس سے زیادتی کرتا ہے۔طاقتور کمزور کو اپنا غلام سمجھتا ہے دولت مند غریب کی تضحیک کرتا ہے۔مالک مزدور کی اجرت کھا جاتا ہے۔مزدور بیوی پہ ظلم کرتا ہے اور اسی طرح ایک لامتناعی سلسلہ جنم لیتا ہے۔جو انسان کے مرنے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ظالم بھی اسی حال میں مرگیا اور مظلوم بھی اسی حال میں مرگیا کہ ان کے بیچ انصاف نہ ہوسکا۔یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ظالم کو اس کے ظلم کا بدلہ دیئے بغیر اور مظلوم کو اس کا حق دلائے بغیر ان کی زندگی کو مکمل کس طرح کہا جاسکتا ہے۔پھر اسی تصویر کو ایک دوسرے رخ سے دیکھیں کہ ایک شخص سچ بولتا ہے پورا تولتا ہے کسی کا حق نہیں مارتا دوسروں کے حقوق ادا کرتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی زندگی مشکل بن کے رہ جاتی ہے۔ایک دوسرا شخص جھوٹ بولتا ہے فریب سے کام لیتا ہے جس کی جو چیز پاتا ہے ہڑپ کر لیتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی زندگی عیش وعشرت کی زندگی بن جاتی ہے۔چنانچہ ان دونوں پہ اگر یہ دنیا اسی حال میں ختم ہو جائے تو کیا ان دونوں انسانوں کے اس مختلف انجام کی کوئی توجیہ کی جاسکتی ہے۔

ایک قوم دوسری قوم پہ ڈاکہ ڈالتی ہے اور اس کے وسائل کے تمام ذرائع پر قبضہ کر لیتی ہے مگر اس کے باوجود وہی نیک نام رہتی ہے اس لیے کہ اس کے پاس نشر واشاعت کے ذرائع ہیں اور دبی ہوئی قوم کی حالت سے دنیا ناواقف ہے کیونکہ اس کو اپنی آہ دنیا تک پہنچانے کے لیے مطلوب وسائل دستیاب نہیں اور یہ آج کی دنیا کی کہانی ہے اپنے اردگرد نظر دوڑائیے کیا یہی نہیں ہورہا؟ امریکہ نے افغانستان پہ کیا اس لیے حملہ کیا اور اس لیے قبضہ کیا ہے کہ طالبان اٹھ کر امریکہ کو تباہ کر دیں بلکہ اس نے افغانستان پہ اس لیے حملہ کیا کہ وہ نظام قرآن کے داعی تھے اور اہل مغرب اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر دنیا کے کسی خطے پہ قرآن اپنے حقیقی دستور کے مطابق نافذ ہوگیا تو مغرب کی بالادستی خاک میں مل جائے گی اس کی اقتصادیات تباہ ہو

جائیں گی۔اس کا سماجی نظام جو پہلے ہی ایک ذلت کا نظام ہے مزید رسوا ہو جائے گا اور اس سے دنیا کا اقتدار چھین لیا جائے گا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ایران میں پہلے ہی اسلام پسند قابض ہیں۔اب افغانستان پہ طالبان کا قبضہ ہو گیا ہے جس کے اثرات پاکستان اور ترکی میں بھی محسوس کیے جا رہے ہیں اور ہر دو ممالک میں اسلام پسند مضبوط ہو رہے۔کل کو اگر ان ممالک میں بھی اسلام پسند حکمران آ جاتے ہیں تو نیٹو کی طرح کا کوئی دفاعی نظام مسلمان بھی اپنے ہاں متعارف کرا سکتے ہیں جس کے بعد امریکہ کی دست درازیاں رک جائیں گی۔ چنانچہ اس نے افغانستان اور عراق پہ فوج کشی کر کے ان کو تباہ کر دیا اور ایران اور پاکستان پر فوج کشی کے لیے پر تول رہا ہے۔

بلکہ پاکستان میں تو شمال مغربی سرحد پہ ان دنوں اس کے حملے جاری ہیں اور حکومت پاکستان روائتی بے حسی کا ثبوت دیتے ہوئے خاموشی سے اپنے شہریوں کا قتل عام دیکھ رہی ہے اللہ ہم پہ اپنا رحم فرمائے۔کیا ظالم اور مظلوم اقوام کی حقیقی تصویر کبھی دنیا کے سامنے آئے گی؟ آ بھی جائے تو کیا ہماری دنیا میں کوئی ایسا نظام عدل قائم ہے جو زور آور کو نکیل ڈال سکے اور مظلوم کی دادرسی کر سکے؟ نہیں اس لیے یہ ایک فطری ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کوئی تو کل ایسا ہو جہاں مظلوم پکار کر اپنے حق کا سوال سکے اور ظالم کسی قوت قاہرہ سے مغلوب ہو۔آج کی دنیا کو ایٹمی دور کہا جاتا ہے مگر میرے خیال میں اگر اس کو خود سری کا دور کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔اس لیے کہ آج کا انسان صرف اپنی رائے اور خواہش پر چلنا چاہتا ہے خواہ اس کی رائے اور خواہش کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو ہر شخص غلط کار ہے۔

مگر ہر شخص گلے کی پوری قوت کے ساتھ خود کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔اخبارات لیڈروں حکمرانوں کے بیانات اور ترسیل خبر کے اداروں کو دیکھیں ہر ایک انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ اپنے ظلم کو عین انصاف اور اپنی غلط کاریوں کو عین حق ثابت کرتا ہوا نظر آئے گا۔کیا اس سارے فریب کا اس سارے گورکھ دھندے کا پردہ کبھی چاک نہ ہو گا؟ انسان کبھی اپنی ان حقیقتوں سے آگاہ نہ ہو گا جن کی بنا پر اس کے بے گناہ خون کو بے دریغ بہایا گیا؟ سچ تو یہ ہے کہ یہ صورت حال صریح طور پہ اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ دنیا نا مکمل ہے اور اس کی تکمیل کے لیے ایک ایسی دنیا ضرور ہونی چاہیے جہاں ہر ایک سے انصاف ہو جہاں ہر ایک کو اس کے درست مقام پہ بٹھایا جائے۔ جہاں عدل کا وہ معیار ہو جس کے خواب دیکھتے دیکھتے انسان کی ہزاروں نسلیں مٹی میں جا ملیں مگر ان کو نہ عدل مل سکا اور نہ حق۔آیئے ایک بار پھر اس مادی نظم پہ نظر ڈالتے ہیں جس کو دوسرے لفظوں میں ہم کائنات بھی کہتے ہیں جہاں اگر کوئی خلا واقعہ ہو تو اس کو پورا کرنے کے لیے فوراً

ہی کوئی قوت متحرک ہو جاتی ہے اور اس خلا کو پورا کرنے کے اسباب دستیاب رہتے ہیں اول تو مادی دنیا میں کوئی کمی ہی نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس انسانی دنیا میں ایک زبردست خلا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس قدرت نے مادی دنیا کو مکمل حالت میں ترقی دی ہے کیا اس کے پاس انسانی دنیا میں موجود اس خلا کو پورا کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں؟ ہمارا احساس بعض افعال کو اچھا اور بعض کو برا سمجھتا ہے ہم کچھ باتوں کے متعلق چاہتے ہیں کہ وہ ہوں اور کچھ باتوں کے متعلق چاہتے ہیں کہ نہ ہوں مگر ہماری اس فطری خواہش کے الرغم وہ سب کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ جس کو انسانی فطرت برا جانتی ہے۔ انسان کے اندر اس طرح کے احساس کی موجودگی یہ معنی رکھتی ہے کہ چونکہ کائنات کی تعمیر حق پہ ہوئی ہے اس لیے یہاں باطل کے بجائے حق ہی کو غالب آنا چاہیے پھر کیا حق ظاہر نہیں ہوگا کیونکہ جو چیز مادی دنیا میں پوری ہو رہی ہے کیا وہ انسانی دنیا میں پوری نہیں ہوگی دراصل اس تصور کے بغیر انسان کے اندر شدت سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ اگر یہی زندگی ہے جو اس وقت نظر آ رہی ہے تو یہ کس قدر لغو زندگی ہے کیونکہ مشاہدے اور سائنسی علوم نے آج اس امر کو واضح کر دیا ہے کہ کائنات میں انسانی زندگی کے ارتقاء کے لیے اس قدر مکمل اہتمام کیا گیا ہے کہ یوں لگتا ہے قدرت کے ترحم کا تمام تر بہاؤ انسان ہی کی طرف ہے۔

مگر دوسری طرف انسان کی زندگی نہایت مختصر اور اتنی ناکام سی ہے کہ سمجھ نہیں آتا انسان کو آخر پیدا کس لیے کیا گیا ہے؟ چنانچہ اس سوال کے اندر پنہاں تہہ در تہہ پیچیدگی نے بہت سے لوگوں کو اس سے متنفر کر دیا اور آج کے جدید معاشروں کا اس سوال کے متعلق عمومی رجحان یہ ہے کہ اس قسم کے کسی بھی جھنجٹ میں پڑنا ہی فضول ہے اور انھوں نے اپنی زندگی ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کے فلسفے تحت گذارنا شروع کر دی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب فلسفیانہ موشگافیاں ہیں جن سے عام آدمی کا کوئی واسطہ نہیں ان کا فلسفہ زیست یہ ٹھہرا کہ انسان کو جو لمحہ حاصل ہے وہ اس کو پر مسرت بنانے کی فکر کرے۔ آئندہ کیا ہوگا یا ہمارے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے وہ صحیح ہے یا غلط اس فکر میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نقطہ نظر کے بارے میں کم ازکم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ اس انداز میں سوچتے ہیں انھوں نے انسانیت کو اس کے مقام سے بہت نیچے گرا دیا ہے۔ وہ مجاز کو حقیقت سمجھ لینا چاہتے ہیں۔ وہ عارضی لذتوں کو ابدی لذتوں پہ ترجیح دے کر دنیا کو گمراہی کے اندھے غار کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ ان کو کبھی بھی خیر کا نمائندہ قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ وہ خود ہی زندگی کے عمومی نظریے سے جس لاابالیانہ پن کا مظاہرہ کر رہے ان کو اس کا بدلہ ملے گا اور مجاز ہی کو حقیقت سمجھ لینے والوں کو کب دانشور قرار دیا جا سکتا ہے۔ کائنات کے تمام مظاہر انھیں ابدیت کا راز معلوم کرنے کی طرف

دعوت دے رہے ہیں مگر وہ چندروزہ زندگی کی عارضی لذتوں پہ ہی قانع ہو گئے ہیں۔انسانی نفسیات کا تقاضا ہے کہ اپنی امنگوں اور حوصلوں کی تکمیل کے لیے ایک وسیع تر دنیا کی تلاش کرے مگر یہ نادان روشنی کے بجائے سایہ کو کافی سمجھ رہے ہیں۔کائنات انسان کو پکار رہی ہے کہ یہ دنیا تمھارے لیے نامکمل ہے تم مکمل دنیا کا کھوج لگاؤ مگر ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم اسی نامکمل دنیا میں اپنی زندگی کی عمارت تعمیر کریں گے ہم کو کسی مکمل دنیا کی ضرورت نہیں۔حالات کا صریح اشارہ ہے کہ اس زندگی کا ایک انجام ہونا چاہیے مگر یہ لوگ صرف آغاز کو لے کر بیٹھ گئے ہیں اور انجام کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔حالانکہ یہ اسی قسم کی ایک حماقت ہے جو شتر مرغ کے متعلق مشہور ہے۔سوچا جائے کہ اگر زندگی کا فی الوقع کوئی انجام ہے تو وہ پیش آ کر رہے گا اور کسی کا اس سے غافل رہنا اس کو روکنے کا سبب تو نہیں بن سکتا۔البتہ ایسے لوگوں کے حق میں وہ ناکامی کا فیصلہ ضرور کر سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زندگی کو ہی تمام قرار دینا کُل قرار دینا اور آج ہی کی مسرت کے لیے ہر وقت مگن رہنا اور اسی کو مقصد بنا لینا پرلے درجے کی کم ہمتی اور بے عقلی کی بات ہے۔آدمی اگر اپنی زندگی اور کائنات پہ تھوڑا سا بھی غور کرے تو اس پر مندرجہ بالا نظریہ کی لغویت فوراً ہی ظاہر ہو جاتی ہے اور ایسا فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے جو حقیقتوں سے آنکھیں بند کر لے اور مادر پدر آزاد زندگی کا آرزومند ہو۔اگر چہ اہل مغرب نے آزادانہ روش کی زندگی اختیار کر کے دیکھ لیا ہے اور ان کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا سوائے رسوائی اور رشتوں کی وارفتگی میں کمی کے۔انھوں نے سیکس کو دیوتا مان کر جو طرزِ زیست اختیار کیا ہے اس نے انھیں کیا دیا ہے سوائے خاندانی نظام کی تباہی کے اور خاندان جب ان کے معاشرے کی اکائی نہ رہا تو اس کے نوجوان نے ہپی ازم میں پناہ ڈھونڈی جہاں کوکین اور افیون کی لت نے مغربی اقوام کی پوری ایک نسل تباہ کر کے رکھ دی خیر مغرب کا سماجی ڈھانچہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں۔

اس لیے جب نظام کائنات پہ ایک نظر ڈالنے سے یہ بات تو ظاہر ہو چکی کہ کائنات کا ایک خالق ہونا چاہیے۔مگر بہت عرصہ تک انسان اس کے وجود سے آشنا نہ تھا کون ہے جو کائنات کے اتنے بڑے نظام کو اتنے سہل اور رواں طریقے سے حرکت دے رہا ہے۔ایک احساس نے ہمیشہ سے انسان کو اپنے گھیرے میں رکھا کہ وہ کون ہے جس کی رحمت وجود انسان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔آخر کوئی تو ہے جس کے احسانات سے ہم ڈھکے ہوئے ہیں اور مجسم شکر و سپاس بن کر ہم اس ہستی کو ڈھونڈنا چاہتے ہیں جس کے آگے اپنے عقیدت کے جذبات کو نثار کر سکیں۔مگر ایسا کوئی وجود ہمیں نظر نہیں آتا۔ہم اس کائنات کے اندر انتہائی عجز اور بے بسی کے

عالم میں ہیں ہم کو ایک ایسی پناہ گاہ کی تلاش ہے جس کے سائے میں پہنچ کر ہم خود کو محفوظ تصور کر سکیں مگر ایسی کوئی پناہ گاہ ہماری نگاہوں کے سامنے موجود نہیں۔ پھر جب ہم اپنی زندگی اور عمر کو دیکھتے ہیں تو کائنات کا یہ تضاد ہم کو ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی عمر تو کھربوں سال ہو اور انسان جو کائنات کا خلاصہ ہے اس کی عمر صرف چند سال۔ فطرت ہم کو بے شمار امنگوں اور حوصلوں سے معمور کرے مگر دنیا کے اندر اس کی تسکین کا سامان فراہم نہ کرے اور مادی دنیا پہ نظر ڈالتے ہیں تو یہاں بھی ایک سنگین تضاد موجود ہے کہ مادی دنیا انتہائی طور پہ مکمل ہے اور اس میں کہیں خلا نظر نہیں آتا۔ مگر انسانی زندگی میں زبردست خلا موجود ہے کہ اشرف المخلوقات کی حالت ساری مخلوق سے بدتر نظر آتی ہے۔ انسان کی بدقسمتی کی انتہا تو یہ ہے کہ اگر پیٹرول کا کوئی نیا چشمہ دریافت ہو یا بھیڑ بکریوں کی نسل بڑھے تو انسان خوش ہوتا ہے مگر انسان کی نسل کا اضافہ خود انسان کے لیے قابل قبول نہیں۔ ہم اپنی مشکلوں سے اس قدر پریشان ہیں کہ انسان کی پیدائش روک دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان حالات میں سوالات ہیں جو انسان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں جو اس کے اندر بھی ابل رہے ہیں اور جن کا دباؤ وہ خارج میں بھی محسوس کرتا ہے۔ انسان کی نارسائی اسے ہر وقت ایک انجان سی بے بسی کا احساس عطا کرتی ہے کہ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ انسان کو زندگی تو عطا کر دی گئی مگر یہ نہ بتایا گیا کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے۔

زندگی کی حقیقت اور اس کی ابدیت کی کھوج میں انسان نے ہزاروں سال بتا دیئے مگر جواب ندارد۔ چنانچہ زندگی کی حقیقت دریافت کرنے کے لیے جب ہم اپنی عقل اور اپنے تجربات کی طرف دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے اساسِ زیست کا درست اور قطعی جواب معلوم کرنا ہماری عقل اور مشاہدے کے بس سے باہر ہے۔ اور اس سلسلے میں عقل انسانی نے اب تک جو آراء قائم کی ہیں وہ اٹکل پچو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس لیے کہ جس طرح ہماری نظر کا دائرہ محدود ہے اور ہم ایک مخصوص جسامت سے چھوٹی چیز کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اور ایک مخصوص فاصلے سے آگے کے اجسام کو بھی نہیں دیکھ سکتے اسی طرح کائنات کے متعلق بھی ہمارا علم ایک تنگ دائرے میں محدود ہے جس کے آگے یا پیچھے کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ ہمارا علم نامکمل ہے اور ہمارے حواس خمسہ ناقص ہیں۔

ہم حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے مثال کے طور پر میدہ اور کالک کو اگر ملایا جائے تو وہ بھورے خاکستری رنگ کا ایک صفوف سا بن جاتا ہے لیکن اس سفوف کا باریک کیڑا جو سفوف کے ذروں ہی کے برابر ہوتا ہے اور انسان کو خورد بین کے بغیر نظر نہیں آتا وہ کیڑا اس سفوف کو کچھ سیاہ اور کچھ سفید رنگ کی چٹان سمجھتا ہے اور اس کے

مشاہدے کے پیمانے کے مطابق خاکستری سفوف کوئی چیز نہیں۔ کچھ ایسا ہی حال انسان کا اس کائنات میں ہے کہ اگر چہ اس کو عقل سے نوازا گیا جس نے طرح طرح کے سوال اٹھا کر انسان کو عاجز کر رکھا ہے مگر اس میں اور کائنات میں کوئی نسبت بنتی نظر نہیں آتی کہ نوع انسانی کی زندگی اس زمانے کے مقابلہ میں جب یہ کرہ ارض وجود میں آیا اس قدر مختصر ہے کہ موازنہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ پھر کرۂ ارض بھی تو کائنات کے اتھاہ سمندر میں ایک قطرہ کے برابر بھی نہیں۔ ایسی صورت میں انسان کائنات کی حقیقت کے بارے میں جو خیال آرائی کرتا ہے اس کو اندھیرے میں اندھے کے ٹٹولنے سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا اور کائنات کی وسعتوں کا تصور کرنے سے انسان کی انتہائی لاعلمی فوراً ہی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اگر ہم اس بات کو سوچیں کہ آفتاب اسی کھرب سال سے موجود ہے اس زمین کی عمر جس پہ ہم بستے ہیں دو ارب سال ہے اور اس زمین پہ زندگی کے آثار نمایاں ہوئے تین کروڑ سال بیت چکے ہیں مگر اس کے مقابلے میں زمین پہ ذی عقل انسان کی تاریخ چند ہزار سال سے زیادہ نہیں ہے تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے چند ہزار سال کا زمانہ جس میں انسان نے اپنی معلومات فراہم کی ہیں اس طویل زمانہ کا بہت حقیر جز ہے جو دراصل کائنات کے اسرار معلوم کرنے کے لیے درکار ہے۔ کائنات کے بے حد طویل ماضی اور نا معلوم مستقبل کے درمیان انسانی زندگی محض ایک لمحہ کی حیثیت رکھتی ہے ہمارا وجود ایک نہایت حقیر قسم کا درمیانی وجود ہے جس کے آگے اور پیچھے کی ہمیں کوئی خبر نہیں اور ہماری عقل کو عاجزی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کائنات اور زندگی کی اصل ماہیت اور رازِ ابدیت جاننے کے لیے ہماری عقل اور ہمارا تجربہ بالکل ناکافی ہیں۔



منزلوں کے نشان

اب تک کی انسانی سعی اس امر کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ہم اپنی محدود صلاحیتوں کے ذریعے کبھی بھی اسرارِ کائنات کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہمارا علم اور ہمارا مشاہدہ ہمیں ایک ایسے مقام پر لا کے چھوڑ دیتا ہے جہاں ہمارے سامنے بہت سے سوالات ہیں؟ ایسے سوالات جو ہر سوچنے والے ذہن سے جواب طلب کرتے ہیں اور اس احساس کو جنم دیتے ہیں کہ اگر ان سوالوں کا کوئی جواب نہ مل سکے تو انسانی زندگی بالکل لغو اور بیکار ہے۔ مگر جب ہم سوچنے بیٹھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے ذہن سے ان سوالات کا جواب حاصل کر ہی نہیں سکتے۔ اس لیے کہ ہم کو وہ آنکھ ہی نہیں ملی جو اس حقیقت کا مشاہدہ کر سکے جس کا تعلق اسرارِ کائنات سے ہو یا ابدیت کی تلاش سے ہو۔ ہمیں وہ ذہن ہی حاصل نہیں جو حقیقت کا براہ راست ادراک حاصل کر سکے چنانچہ اس موقع پر پہنچ کر انسان یہ سوچتا ہے آخران سوالوں کی حقیقت سے انسان کو ناآشنا رکھنے سے خالق کی کون سی مصلحت وابستہ ہے۔ مگر ذرا سے غور پہ یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اگر عام آدمی اور انبیاء کا علم برابر ہو جائے تو پھر ان کی بات کون سنے گا اس لیے انسانی ذہن میں ان کلبلاتے سوالات کا جواب لے کر اللہ

کے پیغمبر انسانوں کے درمیان اترتے رہے اور جنہوں نے ان کی نصیحت پہ کان رکھا ان کو اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا۔ چنانچہ سوالوں میں گھرے اور کائنات کی وسعتوں سے گنگ انسان کے سامنے اللہ کا پیغمبر آتا ہے اور انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے انسان تیرے ذہنِ پریشاں کے ہر سوال کا جواب میرے پاس ہے تو میری بات غور سے سن اور میری نصیحت پہ کان دھر، پھر تجھے جوابوں کی آسودگی عطا کر دی جائے گی۔ کیونکہ مجھے وہ خاص علم عطا کیا گیا ہے جس میں انسان کے تمام سوالوں کے جواب پنہاں ہیں۔ پیغمبر انسان کو بتاتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے جس نے اس سارے عالم کو بنایا ہے اور اپنی غیر معمولی قوتوں کے ذریعہ اس کا انتظام کر رہا ہے۔ جو چیزیں تمہیں حاصل ہیں وہ اسی نے تمہیں دی ہیں اور سارے معاملات کا اختیار اسی کے پاس ہے۔ اور یہ جو تم دیکھ رہے ہو کہ مادی دنیا کے اندر کوئی تضاد نہیں اور وہ ٹھیک ٹھیک اپنے فرائض انجام دے رہی ہے اور اس کے برعکس انسانی دنیا تمہیں ادھوری نظر آتی ہے اور اس میں زبردست خلفشار برپا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو آزادی دے کر اسے آزمایا جا رہا ہے کہ تمہارا مالک تمہارا خالق تم سے یہ چاہتا ہے کہ اس کا قانون جو مادی دنیا میں براہ راست نافذ ہو رہا ہے اس کو انسان اپنی زندگی میں اپنی خوشی سے اختیار کرے۔

یہی وجودِ کائنات کا تقاضا ہے یہی اس کے خالق کی منشا ہے اور یہیں پہ ابدیت کی تلاش تمام ہوتی ہے کہ اگر تم نے ان اصولوں کی پیروی کی جن میں خالق کی منشا ہے تو زندگی کی ابدیت تجھے حاصل ہو گئی۔ چونکہ وہی اس کائنات کا مدبر اور منتظم ہے اور وہی تمھارے جذبہ شکر کا اصل مستحق ہے اور وہی ہے جس کی پناہ میں تم سکون حاصل کر سکتے ہو اس نے تمھارے لیے ایک لامحدود زندگی کا اہتمام کر رکھا ہے جو موت کے بعد آنے والی ہے جہاں تمہاری امنگوں آرزوؤں اور تمناؤں کی حقیقی تسکین کا بندوبست کیا گیا ہے۔ جو زندگی میں ابدیت لائے گی جہاں دکھ اور پریشانی کا گذر تک نہ ہوگا۔ جہاں تمہاری خوشی کو وہ دوام حاصل ہوگا جس کی تشنگی تم دنیا میں محسوس کرتے رہے ہو۔ جہاں حق اور باطل الگ الگ کر دیئے جائیں گے۔ جہاں ظالم کو ذلیل کیا جائے گا اور مظلوم کو اس کا حق دلایا جائے گا۔ جہاں نیکوں کو ان کی نیکی اور بروں کو ان کی برائی کا بدلہ دیا جائے گا۔ تو اے لوگو! تمھارے اللہ نے میرے ذریعے تمہاری طرف اپنی کتاب بھیجی ہے جس کا نام قرآن ہے جو اس پہ ایمان لائے گا کامیاب ہو جائے گا اور جو اس کا انکار کرے گا اس کو ذلیل کر دیا جائے گا۔ یہ وہ آواز تھی جو عرب کے ریگستانوں میں گونجی جب عربوں کے تھکے ماندے قافلے نیم شب نخلستانوں میں اترتے تو لوگ ایک دوسرے سے اس آواز کا تذکرہ کرتے کہ سرزمین مکہ میں کوئی محمد ﷺ نامی شخص ہے جو ایسی باتیں جانتا

ہے کہ انسان کو حیران کر دے۔ کہتے ہیں اس کے کلام میں اتنی شرینی ہے کہ لوگ اپنے ہی دانتوں سے اپنی انگلیاں چبا لیتے ہیں۔ اس کے لہجے میں ایسا ٹھہراؤ ہے کہ بادِ صبا بھی شرما شرما جائے جس کی اِک اِک ادا پہ اس کے ماننے والے قربان ہو جاتے ہیں۔ محمد ﷺ کی یہ آواز چودہ سو برس پہلے عرب کے ریگزاروں سے بلند ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں گونج گئی۔ جس میں کائنات اور زندگی کے ہر الجھے ہوئے سوال کا جواب موجود تھا جس میں پیغام تھا کہ اگر حقیقت کو معلوم کرنا چاہتے ہو تو میری آواز پر کان لگاؤ اور میں محمد ﷺ جو کچھ کہتا ہوں اس پہ غور کرو۔ سوال یہ تھا کہ کیا یہ آواز حقیقت کی واقعی تعبیر ہے کیا ہمیں اس پہ فوراً ایمان لے آنا چاہیے یا ان بنیادوں کی کھوج میں لگ جانا چاہیے جو اس آواز کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کریں۔ یہ سوال اس وقت بھی گونجا تھا جب آپ ﷺ اہل عرب کو پوری دردمندی سے پکار رہے تھے اور یہ سوال آج کی متمدن دنیا میں بھی بہت سے لوگوں کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ اس لیے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس حقیقت کو وہ اس وقت تسلیم کریں گے جب وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

مگر یہ مطالبہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص فلکیات کا مطالعہ علم ریاضی کے بغیر کرنے کی کوشش کرے اور وہ کہے کہ وہ فلکیاتی سائنس کی صرف ان دریافتوں کو ہی تسلیم کرے گا جو کھلی آنکھوں سے اسے نظر آتی ہوں اور علم ریاضی کی کوئی دلیل اسے قبول نہیں۔ یہ مطالبہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی کو اپنی قوت کا صحیح علم نہیں ہے اس لیے کہ انسان کے پاس مشاہدے کی جو قوتیں ہیں وہ نہایت محدود ہیں اور حقیقت ہمارے لیے ایک ناقابل مشاہدہ چیز ہے ہم اسے محسوس تو کر سکتے ہیں مگر اسے دیکھ نہیں سکتے۔ ایک زمانے میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ کائنات دنیا کی چار چیزوں سے مل کر بنی ہے ''آتش و آب و خاک و باد'' دوسرے لفظوں میں قدیم انسان اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ حقیقت ایک ایسی چیز ہے جسے دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مگر جدید تحقیق نے اس انسانی غلط فہمی کی تصیح کر دی اور آج کے جدید سائنسی تمدن میں ہم جانتے ہیں کہ ہماری اس کائنات کی تمام چیزیں اپنے آخری تجزیے میں ایٹم کے باریک ترین ذرات پر مشتمل ہیں۔ ایٹم ایک اوسط درجہ کے سیب سے اتنا ہی چھوٹا ہوتا ہے جتنا کہ وہ سیب ہماری زمین سے۔ مگر ہر ایٹم خود اپنے اندر ایک کائنات سجائے بیٹھا ہے جس کے متعلق ابھی انسان صرف اتنا ہی جانتا ہے کہ ہر ایٹم کے اندر ایک طرح کا نظام شمسی موجود ہے جس کا ایک مرکز ہے اور اس مرکز میں نیوٹران اور پروٹان ہوتے ہیں اور اس کے چاروں طرف الیکٹران مختلف مداروں میں اس طرح حرکت کرتے ہیں کہ جیسے سورج کے گرد اس کے تابع سیارے حرکت میں رہتے ہیں۔ ایک برقیہ جس کو الیکٹران بھی کہا جاتا ہے اس کا قطر سینٹی میٹر کا پانچ ہزار کروڑواں حصہ ہو اور جو اپنے مرکز کے گرد

چاروں طرف ایک سیکنڈ میں کروڑوں مرتبہ چکر کاٹتا ہو اس کے تصور کی کوشش بھی سعی لاحاصل ہی ہے۔ جب کہ ہمیں ابھی یہ بھی معلوم نہیں کہ اس ایٹم کے اندرونی عالموں کی آخری حد کیا ہے ممکن ہے ان عالموں کے اندر ان سے بھی چھوٹے عالم موجود ہوں جو ابھی انسان کی حدِ ادراک سے پوشیدہ ہوں۔ چنانچہ جہاں صرف ایک ایٹم یعنی ایک ذرے کے اندرونی عالموں پہ انسانی علم ختم ہو جاتا ہو وہاں انسان کو ایسا علمی تکبر زیب نہیں دیتا کہ وہ خالق کے وجود کا ہی انکار کر بیٹھے یا اس کے معمور کردہ پیغمبروں کی تعلیمات پہ انگلیاں اٹھائے۔ انسان کی قوت مشاہدہ اتنی کمزور ہے کہ وہ ابھی ایٹم کی کلی ماہیت کو بیان کرنے سے بھی قاصر ہے۔ ابھی وہ نہیں جانتا کہ پروٹان اور نیوٹران کے وہ انتہائی چھوٹے ذرے جو باہم مل کر مرکز بناتے ہیں وہ کس طرح وہاں قائم رہتے ہیں۔ آخر یہ پروٹان اور نیوٹران مرکز سے باہر کیوں نہیں نکل جاتے اور وہ کون سی طاقت ہے جو انھیں ایک دوسرے سے باندھے رکھتی ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ان مادی ذرات کے درمیان ایک قسم کی توانائی موجود ہے اور یہی توانائی مرکز کے برقی اور غیر برقی ذرات کو آپس میں جکڑے ہوئے ہے۔ اس طاقت کو یکجائی (Binding Energy) کا نام دیا گیا ہے گویا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مادہ اپنے آخری تجزیے میں توانائی ہے۔ مگر پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا توانائی قابل مشاہدہ چیز ہے کیا کسی خوردبین کے ذریعے توانائی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور کیا (Binding Energy) کے نظریے کو ایک ثابت شدہ صداقت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب اگر خود سائنس اس بات کو تسلیم کر رہی ہے کہ توانائی کا مشاہدہ ممکن نہیں تو گویا اس نے خود ہی بتا دیا کہ کائنات کی حقیقت اپنی آخری صورت میں ایک ناقابل مشاہدہ چیز ہے جس کو انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

اب اگر کوئی کم عقل یہ شرط لگاتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جو حقیقت بیان کرتے ہیں اور وہ جن حقیقتوں کی خبر دے رہے ہیں وہ ہمیں چھونے اور دیکھنے کو ملنی چاہییں تب ہی ہم ان پر ایمان لائیں گے تو یہ ایک نہایت احمقانہ مطالبہ ہے جسے سائنس کی مادی روایات کی تائید بھی حاصل نہیں کجا کہ مذہب اور روحانیت کے میدان سے اس کے لیے کوئی دلیل پیش کی جا سکے۔ تاہم کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ کیا نبی کی دعوت کو عقل کی بنیاد پہ پرکھا جا سکتا ہے یا نہیں اور وہ کونسی بنیادیں ہیں جن کی روشنی میں انسان یہ فیصلہ کرے کہ وہ نبی کی دعوت قبول کرے یا اس پہ مزید غور و فکر کرے۔

میرے نزدیک نبی کی دعوت کو جانچنے کے تین خاص عقلی پہلو موجود ہیں۔

اول؛

نبی کی توجیہ حقیقت کائنات سے کتنی مطابقت رکھتی ہے۔

دوم؛

زندگی کے انجام کے بارے میں اس کے دعویٰ کے پیچھے کیا دلیل ہے۔

سوم؛

نبی کے کلام میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پہ اسے اللہ کا کلام قرار دیا جا سکے۔

چنانچہ جب ہم ان تینوں پہلوؤں کے اعتبار سے نبی کے کام جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان میں سے ہر ایک پر نہایت کامیابی سے پورا اتر رہا ہے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے کائنات کی جو توجیہ کی ہے اس میں تمام انسانی پیچیدگیوں کا حل موجود ہے اور ہمارے اندر اور ہمارے باہر جتنے بھی سوالات ابلتے ہیں اس کی تعلیمات میں ان سب کا جواب موجود ہے۔ زندگی کے انجام کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا جو دعویٰ ہے اس کے لیے وہ ایک قطعی دلیل بھی اپنے پاس رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ موجودہ زندگی میں وہ اس انجام کا ایک نمونہ ہمیں دکھا دیتا ہے جس کو بعد کی زندگی میں آنے کی خبر وہ دے رہا ہے اور پھر وہ کلام جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے اس کے اندر اتنی غیر معمولی خصوصیات پائی جاتی ہیں کہ ماننا پڑتا ہے کہ یقیناً وہ ایک فوق الانسانی کلام ہے اور ایسا اعلیٰ کلام انسان کے بس سے باہر کی بات ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کی صداقت کے لیے اگرچہ کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر انسانوں کا ایک انبوہ ہے جو تشکیک اور تذبذب کا شکار ہے۔ ان میں مسلم بھی شامل ہیں اور غیر مسلم بھی۔ ان میں آج کے عقلاء بھی ہیں اور کل کے فلسفی بھی۔ کسی نے سائنس کو خدا بنا لیا تو کوئی معیارِ زیست اور مادی الجھاوے میں الجھ کر رہ گیا۔ کسی نے معیشت کو خدا قرار دیا، تو کسی نے آبائی اقدار کو، کسی نے بتوں کی پوجا کی تو کسی نے آگ کی، کسی نے سورج کو خدا کہا، تو کسی نے ہواؤں اور سمتوں کو پوجا، کسی نے جنس میں انسانیت کی تشنگی کے اسباب کھوجے، تو کسی نے دولت کی مساوی تقسیم کو انسانی دکھوں کا مسیحا قرار دیا۔ چنانچہ افکار کے اس ہجوم میں اگر نبی مکرم ﷺ کے افکار کو ایک روشن دلیل کی صورت پیش نہ کیا جائے تو اندھیرا بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اس لیے عقل پرستوں کو روحانیت کی اس گلی میں نکلنا پڑے گا جہاں روشنی ہے ورنہ ان کے اپنے ہی نظریات ان کی قتل گاہیں بن جائیں گے اور تاریخ کے مختلف ادوار میں ایسا ہوتا چلا آیا ہے کہ مارکس جو دن رات دنیا کی دولت کا حساب

جتا تا رہتا تھا اس کو اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے شہر کے کوڑا دان الٹنا پڑتے تھے۔ پیغمبر کی صداقت کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تعلیمات انسانی نفسیات کے عین مطابق ہوتی ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی پیدائش جس فطرت پہ ہوئی ہے وہی فطرت اس کی توجیہ بھی ہے اور اس توجیہ کی بنیاد ایک خدا کے وجود پہ رکھی گئی ہے اور ایک خدا کا شعور انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کے دو مضبوط قرینے ہیں ایک یہ کہ انسانی تاریخ کے تمام معلوم زمانوں میں انسانوں کی اکثریت نے بلکہ ان کی تقریباً تمام تعداد نے خدا کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ انسان پہ کبھی بھی ایسا کوئی دور نہیں گذرا جب اس کی اکثریت خدا کے شعور سے خالی رہی ہو۔ قدیم ترین زمانوں سے لے کر آج تک انسانی تاریخ کی متفقہ شہادت یہی ہے کہ خدا کا شعور انسانی فطرت کا نہایت طاقتور شعور ہے۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ جب بھی انسان پہ کوئی نازک وقت آتا ہے تو اس کا دل بے اختیار اس خدا کو پکار اٹھتا ہے جسے عام حالات میں وہ ماننے پر ہی تیار نہیں ہوتا۔ جب اس کو کوئی مادی سہارا دکھائی نہیں دیتا تو وہ عالم غیب سے اس سہارے کو پکارتا ہے۔ چنانچہ جاہل ہو یا عالم، خدا پرست ہو یا ملحد، روشن خیال ہو یا بنیاد پرست جب بھی اس پہ ایسا وقت آتا ہے جب عام انسانی قوتیں جواب دیتی ہوئی نظر آتی ہیں تو اس کے اندر وہ شعور انگڑائی لے کر بیدار ہوتا ہے جسے اس نے جھوٹے دلائل دے دے کر سلایا ہوتا ہے۔ وہ طاقتور شعور اس کی راہنمائی اس طاقت کی طرف کرتا ہے جو سب سے بڑھ کر طاقتور ہے جو ساری قوت کا منبع ہے۔

پس انسان اپنے نازک ترین لمحات میں خدا کو یاد کرنے پر مجبور ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال ہمیں سٹالن کی زندگی میں ملتی ہے جس کا ذکر برطانوی وزیراعظم مسٹر چرچل نے دوسری جنگ عظیم کے حالات سے متعلق اپنی کتاب کی چوتھی جلد میں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے ۱۹۴۲ء کے نازک حالات میں جب ہٹلر سارے یورپ کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا تو چرچل نے ماسکو کا سفر کیا اس موقع پر چرچل نے سٹالن کو اتحادی فوجوں کی کاروائی کے متعلق اپنے منصوبے کی تفصیلات بتائیں۔ چرچل کا بیان ہے کہ منصوبے کی تشریح کے ایک خاص مرحلہ پر جب سٹالن کی دلچسپیاں اس منصوبے میں بہت بڑھ چکیں تھیں تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا کہ "خدا اس مہم کو کامیاب کرے

(May God prosper this undertaking)

اور یہ صدا ایک ایسی زبان سے بلند ہوئی جو کسی بھی خدا پر یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

پھر دیکھیں کہ نبی ﷺ کی آواز میں یہ خصوصیت بھی ہے کہ وہ ان تمام سوالوں کی توجیہ ہے جو انسان معلوم کرنا

چاہتا ہے اور جو کائنات کے مطالعہ سے ہمارے ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ مظاہرِ کائنات کے مطالعہ نے ہمیں اس نتیجہ تک پہنچایا تھا کہ کائنات محض اتفاق سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ ضرور کوئی اس کا پیدا کرنے والا ہے کوئی بہت ہی ارفع منصوبے والی قوت کائنات کو رواں رکھے ہوئے ہے پھر جن لوگوں نے کائنات کی یہ تشریح کی کہ وہ ایک مادی مشین کی طرح ہے ان کو بھی فطرت کی طرف سے شکست کا سامنا کرنا پڑا پھر یہ نظریہ بھی اوراقِ تاریخ میں کہیں اوجھل ہو گیا۔ بلکہ آج خود سائنس ان بنیادوں پہ سوچنے لگی ہے کہ کائنات اتنی وسیع اور اس کا انتظام اتنا پیچیدہ ہے کہ ضرور اس کے پیچھے کسی غیر معمولی قوت کا وجود ہے جو اسے چلا رہی ہے۔

جانے کب سے انسان کو اپنے اس محسن کی تلاش تھی جس کے احسان وہ اپنی پور پور میں محسوس کرتا چلا آیا تھا۔ اسے ایک ایسی ہستی کی تلاش تھی جو اس کا سہارا بن سکے۔ اس توجیہ میں اس احساس کا جواب بھی موجود ہے ایک مدت تک انسان کو یہ خیال ستاتا رہا کہ کائنات کے مقابلے میں انسان کی عمر اتنی کم کیوں ہے اور وہ اس کو لامحدود دیکھنا چاہتا ہے۔ اس ابدیت کی تلاش میں تھا جہاں اس کی امنگوں کی تکمیل ہو سکے۔ نبی ﷺ کی تعلیم میں اس کی توجیہ بھی موجود ہے پھر انسانی حالات کا شدید تقاضا تھا کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت ہو جائے اور اچھے برے لوگ الگ الگ کر دیئے جائیں اس سوال کا جواب بھی اس توجیہ میں موجود ہے۔

الغرض زندگی سے متعلق تمام سوالات کا حل نبی ﷺ کی تعلیم میں موجود ہے اور اتنی مکمل حالت میں موجود ہے کہ اس سے بہتر جوابات کا انسانیت تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ یہ یقینی بات ہے کہ علم وحی سے وہ سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں جو کائنات کے پیچیدہ نظام سے انسانی ذہن میں جنم لیتے ہیں۔ نبی ﷺ کی دعوت کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسلام زندگی کے انجام کے بارے میں وہ جو نظریہ پیش کرتا ہے اس کا ایک واقعاتی نمونہ خود نبی ﷺ کی زندگی میں ہمیں دکھائی دے جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں بیان کیا گیا کہ یہ دنیا اسی طرح ظالم اور مظلوم کو لیے ہوئے ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ اس کے انجام پر کائنات کا مالک ظاہر ہو گا۔ تب سچوں اور جھوٹوں کو الگ الگ کر دیا جائے گا اور اس دن کے آنے میں جو دیر ہے وہ صرف اس مہلتِ کار کے ختم ہونے کی ہے جو انسان کے لیے مقدر کی گئی ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ یہ بات کہہ کے اس کو یونہی نہیں چھوڑ دیتے بلکہ اس کے ساتھ ان کا یہ دعویٰ بھی شامل ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس کے صحیح ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس عدالت کا ایک نمونہ مالک کائنات میرے ذریعے سے اسی دنیا میں تم کو دکھائے گا اور میری ہی ذات سے وہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کر کے دکھائے گا۔ وہ اپنے فرماں برداروں کو عزت دے گا اور اپنے

نافرمانوں کو ذلیل کر کے انھیں عذاب میں مبتلا کرے گا اور یہ واقعہ بہر حال ظہور میں آئے گا دنیا کے لوگ چاہے اس کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کریں اور چاہے وہ اپنی ساری طاقت اس کو روکنے میں لگا دیں۔ جس طرح آخرت کا ہونا قطعی طور پہ مقدر ہے اسی طرح میری زندگی میں اس کا نمونہ دکھایا جانا بھی لازمی ہے۔ یہ ایک نشان ہوگا اس آنے والے دن کا اور یہ دلیل ہوگی اس بات کی کہ کائنات کی تعمیر عدل پہ ہوئی ہے اور یہ کہ جس طاقت کا میں نمائندہ ہوں وہ ایک ایسی طاقت ہے جس کی طاقت سب پہ بالا ہے اور یہی طاقت ایک روز تم کو اپنے سامنے کھڑا کر کے تمام اگلے پچھلے انسانوں کا فیصلہ کرے گی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ نبی ﷺ اپنی قوم کے سامنے یہ چیلنج اس وقت رکھتے ہیں جب کہ وہ بالکل تنہا تھے، پوری قوم ان کی دشمن ہوگئی تھی، خود ان کا اپنا ملک ان کو جگہ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ نبی ﷺ کے قریب ترین اعزا نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، ان کے پاس مادی وسائل و ذرائع میں سے کچھ بھی نہ تھا۔ مگر ان مخدوش حالات میں بھی ان کے لہجے میں موجود یقین اس بات کو متعین کرتا تھا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کے پیچھے ایک مضبوط دلیل موجود ہے جس کا یقین چاہے روح زمین پہ کوئی نہ کرے مگر نبی کو اس پہ پورا شرح صدر حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے اس بے سروسامانی کے باوجود نبی ﷺ با آواز بلند اعلان کرتے ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ میں ہی غالب رہوں گا اور میرے ذریعے ہی خدا کی عدالت اسی زمین پہ قائم ہوگی۔ لوگ ان کا دعویٰ سنتے ہیں مگر ان کی بے سروسامانی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ نبی ﷺ ان کے اس ردِ عمل کو نظر انداز کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے اپنا کام کیے جاتے ہیں۔

دشمن اپنا دباؤ ان پہ بڑھا دیتے ہیں اور ملک کی اکثریت ان کے قتل کا فیصلہ کر لیتی ہے وہ آپ ﷺ کو جلاوطنی پہ مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ آپ ﷺ کی دعوت کی راہ کو روکنے لیے تمام دستیاب وسائل استعمال کرتے ہیں۔ وہ نبی ﷺ کو ناکام بنانے کے لیے ہر حربہ اختیار کرتے ہیں اور اس پہ اپنا سارا زور صرف کر دیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی سب چالیں بے اثر رہتی ہیں ان کے تمام منصوبے ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں اور اللہ کی طرف سے ان کے سروں پہ خاک ڈال دی جاتی ہے جس طرح ان کے دلوں پہ پردہ ڈالا گیا تھا۔ وہ ناکام رہتے ہیں اور فتح و نصرت نبی ﷺ کے قدم چومتی ہے۔ اگر چہ بہت تھوڑے لوگ آپ ﷺ کا ساتھ دیتے ہیں اور ایک معمولی اکثریت آپ کی ہمنوا تھی۔ جب کہ دوسری طرف تمام ملک آپ کا دشمن تھا ایک طرف ساز و سامان ہے اور لاؤ لشکر ہے۔ دوسری طرف بے سروسامانی ہے اور معمولی اقلیت، ایک طرف دشمن کو ملکی باشندوں کی حمایت حاصل ہے اور دوسری ہمسایہ اقوام کی پشت پناہی بھی۔ جب کہ اس طرف اپنوں اور

غیروں کی متفقہ مخالفت۔ حالات کی اس انتہائی ناسازگاری کو دیکھتے ہوئے نبی ﷺ کے ساتھی گھبرا اٹھتے ہیں مگر نبی ﷺ کے لبوں پہ یقین کی وہی پراسرار مسکراہٹ سجی ہے جو دعوت کے اولین روز سے ان کے ہمراہ تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو حوصلہ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خدا کا فیصلہ آ کر رہے گا اور کوئی طاقت اس کو روک نہیں سکتی۔ پھر اس چمکتے سورج اور جگمگاتے چاند نے دیکھا، ابر و ہوا نے دیکھا، مکہ کے ایک ایک پتھر ایک ایک شجر نے دیکھا اور خود پورے عرب نے دیکھا کہ نبی کے دعویٰ کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ وہ مکمل شکل میں پورا ہوا۔ تاریخ میں اس طرح کی مثال کم ہی ملتی ہے کہ کوئی شخص اس طرح کا دعویٰ کرے اور وقت اس کو اتنی جامعیت کے ساتھ پورا کرے۔

چنانچہ نبی ﷺ نے جس دعویٰ کے ساتھ اپنی دعوت اور کارِ نبوت کا آغاز کیا تھا دشمن اپنی پوری قوت کے باوجود اس میں ذرا بھر بھی کمی نہ کر سکے۔ حق اور باطل الگ الگ ہو گیا۔ خدا کے فرماں برداروں کو عزت اور غلبہ حاصل ہوا اور خدا کے نافرمانوں کا روز توڑ کر انھیں محکوم بنا دیا گیا۔ اللہ نے نبی ﷺ کو ان کا وطن بھی واپس دلا دیا اور ان کے یقین محکم کو دلیل بھی فراہم کر دی۔ اس طرح اسلام کی دعوت نے انسانوں کے لیے جس انجام کی خبر دی تھی اس کا ایک نمونہ دنیا میں قائم کر دیا گیا جو قیامت تک کے لیے غور کرنے والوں کے لیے نشان عبرت ہے اور اس نمونہ کی حتمی تکمیل روزِ محشر ہو گی جب سارے انسانوں کو خدا کی عدالت میں حاضر کر کے ان کا آخری فیصلہ کیا جائے گا۔



معرفت کے رستے

انسان نے جب اصولِ کائنات پہ نگاہ عمیق ڈالی تو اس نے جانا کہ خالق کی طرف سے کائنات میں کسی بھی مخلوق سے بے توجہی کا رویہ اختیار نہیں گیا بلکہ اس کی طرف سے اپنی مخلوقات کے لیے مدد اور راہنمائی کا ایک مستقل سلسلہ ہے جو ازل سے جاری ہے اور جس کی بنا پہ ہی چیونٹی سے لے کر اژدھے تک نے اپنا سماج تعمیر کیا ہے۔ خالق کی اس کائنات میں ابھی انسان صرف کئی لاکھ مخلوقات کی پہچان کر سکا ہے۔ اگرچہ اسرار کے دبیز پردوں میں خالق کے انگنت کرشمے آنے والے وقت میں انسانی آنکھ کے منتظر ہیں۔ سمندر کی تہوں میں وہ کل تک جن کو پودے سمجھتا تھا آج ان کی پہچان بدل چکی ہے اور انسان انھیں مچھلی کی نسل کی کوئی مخلوق قرار دیتا ہے۔ اسی طرح جب اس کے مشاہدے کو وسعت ملی تو اس نے جانا کہ کائنات میں پائی جانے والی ہر جاندار چیز ایک امت ہے اور چڑیا سے لے کر شیر تک اپنے سماجی رویوں کی پہچان رکھتے ہیں جو

صدیوں پر محیط ہیں۔شہد کی مکھی اگر کسی ملکہ مکھی کے حکموں کو تسلیم کرتی ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ اس کی تہذیبی بناوٹ اس کو آگہی فراہم کرتی ہے کہ اس کی نسل یا اس کی امت میں عمومی رویے کیا ہوں گے۔ایک معمولی بھڑ (انجنا) کی مثال لیں بھڑ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انڈے دینے سے پہلے ایک گڑھا کھودتی ہے پھر ایک ٹڈے کو قابو کر کے اس کو گڑھے کے کنارے پہ رکھ دیتی ہے۔جب وہ ٹڈے کو پکڑ لیتی ہے تو ڈنک مارتے وقت وہ نہایت صحت کے ساتھ ٹڈے کے خاص عصبی مقام پہ ڈنک مارتی ہے۔مگر یاد رہے کہ وہ ایک خاص اندازے سے ٹڈے کے جسم میں صرف اتنا ہی زہر داخل کرتی ہے جس سے وہ بے ہوش ہو جائے۔ہزاروں بلکہ لاکھوں سال سے بھڑ یہ عمل کر رہی مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ٹڈا اس کے ہاتھ سے مر گیا ہو۔کیونکہ اگر وہ مر جائے تو بھڑ کا مشن ناکام ہو جائے۔ٹڈے کو بے ہوش کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جب اس کے بچے انڈوں سے نکلیں تو ان کو تازہ گوشت فراہم ہو جائے۔چنانچہ بھڑ ٹڈے کو بیہوش کر کے اس کے گرد انڈے دینا شروع کر دیتی ہے۔جب اس کے بچے انڈوں سے باہر نکلتے ہیں تو ان کو اپنی بقاء کے لیے زیادہ جدوجہد کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ ٹڈے کا تازہ گوشت ان کی ضیافت کے لیے پہلے ہی وہاں موجود ہوتا ہے۔

وہ ٹڈے کے زندہ گوشت کو دھیرے دھیرے کھاتے رہتے ہیں اگرچہ وہ نہیں جانتے کہ یہ گوشت ان کے لیے مضر صحت ہے یا نہیں۔مگر ان کی ماں ضرور جانتی تھی کہ مردہ ٹڈے کا گوشت ان کے نقصان دہ ہوگا اس لیے وہ ٹڈے کو مرنے نہیں دیتی اتنا انتظام کر لینے کے بعد بھڑ وہاں سے اڑ جاتی ہے اور پھر لوٹ کے کبھی نہیں آتی اور نہ کبھی اپنے بچوں کو دیکھتی ہے۔مگر اس کے باوجود جب اس کا بچہ بڑا ہوتا ہے تو وہ ٹھیک اسی عمل کو دھراتا ہے اور ساری بھڑیں اپنی زندگی میں ایک بار اور پہلی بار اپنی نسل کی بقاء کے لیے بالکل ٹھیک انداز سے وہی کام سر انجام دیتی ہیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بھڑ کے بچے کو اپنی آئندہ نسل کی بقاء کے لیے اس اندازِ زیست کی طرف کون راغب کرتا ہے؟ کون اس کو بتاتا ہے کہ اگر وہ ایک ٹڈے کو قابو کر کے اس کے اردگرد انڈے نہ دے گی تو اس کی نسل خطرے میں پڑ جائے گی؟ حالانکہ اس نے اپنے ماں باپ کو کبھی یہ عمل کرتے نہ دیکھا تھا؟مشہور جرمن فلسفی برگساں بھڑ کے اس عمل کے بارے میں لکھتا ہے کہ میں نے حیرت سے بھڑ کے ان رویوں کے بارے میں سوچا تو مجھے محسوس ہوا جیسے بھڑ نے کسی اعلیٰ ماہر عضویات سے تعلیم حاصل کی ہو۔انسانی علوم نے بھڑ کے ان رویوں کو اس کی جبلت قرار دیا۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جبلت کیا ہے اور اس کا محرک اول کیا ہے جو کسی بھی مخلوق کو ایسے عمل پہ اکساتا ہے جو اس کی زندگی کے لیے فائدے کا باعث

ہو۔اسی طرح ایک لمبی مچھلی کو لیجئے جسے انگریزی میں (Eal) کہا جاتا ہے۔ڈنمارک کے ماہر حیوانات ڈاکٹر شمٹ (Dr Johannes Schmidt) نے کئی سال کی تحقیق کے بعد معلوم کیا ہے کہ یہ عجیب و غریب مچھلی اپنی زندگی کی جوانی ہر جگہ کے آبی مرکزوں میں گذار کر اپنی موت سے قبل جزیرہ برموداکے پاس جمع ہوتی ہے اور وہیں یہ سب مچھلیاں انڈے دے کر مر جاتی ہیں۔کہا جاتا ہے کہ بحرہ اٹلانٹک میں جزیرہ بر موداکے آس پاس سمندر کی گہرائی میلوں تک پہنچ جاتی ہے اور یہاں سمندر اپنی انتہائی گہرائی کو جا چھوتا ہے یورپ کی ایلین مچھلیاں سمندروں میں تین ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں پہنچتی ہیں ۔جزیرہ برموداکی گہرائیوں میں آنکھ کھولنے والے یہ بچے اپنے آپ کو ایک سنسان آبی مرکز میں پڑا پاتے ہیں۔ان کے پاس بظاہر معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اس کے باوجود بھی اپنی زندگی کے اختتامی ایام تک پہنچنے سے پہلے وہ انھیں پانیوں کے کنارے آلگتی ہیں جہاں سے کبھی ان کے والدین چلے تھے۔وہ آگے بڑھتے ہوئے اپنے ماں باپ والی ندیوں جھیلوں اور آبی مرکزوں میں پہنچ جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کسی بھی آبی مرکز سے ایلیں ہمیشہ کے لیے غائب نہیں ہو جاتیں اور یہ سب کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ امریکہ کی کوئی ایل یورپ میں نہیں ملتی اور نہ یورپ کی کوئی ایل امریکہ کے سمندروں میں پائی جاتی ہے۔

پھر ان مچھلیوں کو آمدورفت کی یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوتی ہیں؟ یہ سوال کہ ان کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے صدیوں انسان کی الجھن بنا رہا؟ تاہم قرآن نے انسان کو بتایا کہ یہ سب وحی کے ذریعہ ہوتا ہے''وحی'' پیغام رسانی کے اس مخفی سلسلے کو کہتے ہیں جو خدا اور اس کی مخلوقات میں ہمیشہ سے جاری ہے۔کوئی مخلوق زندگی گزارنے کے لیے کیا کرے اور خالق کائنات نے مجموعی اسکیم کے اندر اس کے ذمے جو فرض عائد کیا ہے اس کو وہ کس طرح انجام دے اسی کا نام وحی ہے۔اس وحی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا تعلق انسان کے سوا دوسری مخلوقات کے ساتھ ہے اور ایک وہ جس کا تعلق خاص انسان سے ہے۔انسان کے سوا کائنات کی وسعتوں یا زمین کے اس تختے پر جتنی بھی سانس لینے والی مخلوقات پائی جاتیں ہیں وہ سب کی سب ارادے سے خالی ہیں ان کا کوئی کام کسی سوچے سمجھے فیصلے اور ارادے پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ ایک شعوری قسم کے طبعی میلان کے تحت ہوتا ہے جس کو سائنس کی زبان میں جبلت (Instinct) کہا جاتا ہے۔مذہب اور الٰہیات میں اسے وحی کہتے ہیں گویا کائنات کے تمام جاندار ایک طرح کی مشینیں ہیں جو ایک محدود دائرے میں اپنا متعین عمل مکمل کرتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں۔چنانچہ اس قسم کے جانداروں کے لیے ارادہ واختیار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اس لیے کہ ان کے پاس جو وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں نہیں بلکہ جبلت یا

عادتِ فطری کے کی شکل آتی ہے۔خالق کے خصوصی امر کے تحت ان کی ساخت اس طرح کی بنائی جاتی ہے کہ وہ ایک مخصوص کام کو بار بار دھراتے رہیں مگر انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو فیصلے کی قوت رکھتا ہے جسے خالق کی طرف سے مرضی اور ارادے میں آزادی عطا فرمائی گئی ہے۔چنانچہ وہ اپنے ذاتی ارادے سے کسی کام کو کرتا ہے اور کسی کام کو نہیں کرتا۔وہ ایک کام شروع کرتا ہے پھر اسے بلقصد چھوڑ دیتا ہے۔پہلے وہ ایک کام نہیں کرنا چاہتا پھر اسی کو کرنا شروع کر دیتا ہے۔اس سے ظاہر ہوا کہ انسان بھی اگرچہ اسی طرح خدا کی مخلوق ہے جس طرح کہ دوسری مخلوقات ہیں مگر وہ اس لحاظ سے کائنات کی دوسری تمام مخلوقات سے منفرد ہے کہ اسے عمل و ارادہ میں آزادی عطا کی گئی ہے اور اسی آزادی کی بدولت اسے حالت امتحان میں رکھا گیا ہے۔جو کام دوسری مخلوقات سے عادت وفطرت کے تحت لیا جا رہا ہے وہی کام انسان کو اپنے فیصلے اور ارادے سے کرنا ہے یہی اس کا اصل امتحان ہے۔چنانچہ انسان کے پاس جو وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں آتی ہے نہ کہ عادت اور جبلت کی صورت میں۔دوسرے لفظوں میں اس حقیقت کی تشریح یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ عام حیوانات کی وحی ان کی فطرت میں پیوست کر دی جاتی ہے حیوانات یا چرند پرند کو کیا کرنا ہے اس کا علم وہ پیدائشی طور پہ اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں۔

اس کے برعکس انسان جب عقل و شعور کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کو اس کے احکامات یا قوانین کی وحی خارج سے سنا دی جاتی ہے اور اس کے ارادہ عمل کو آزمانے کے لیے اللہ اس کو مہلت عطا فرما دیتا ہے۔کہ انسان میرے احکام اور قوانین کو مانتا ہے یا بغاوت وانحراف کی راہ اختیار کرتا ہے۔اس پیغام رسانی کا طریقہ کار یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے درمیان اپنے خاص بندے ایک خاص علم کے ساتھ مزین کر کے انسانوں کے درمیان اتارتا ہے جن کو ہم نبی یا رسول کہتے ہیں۔وہ انسان کو بتاتے ہیں کہ خالق کی رضا کس میں ہے۔انسان کی کامیابی کا راستہ کون سا ہے۔انسان کو کیا کرنا چاہیے اور کس چیز سے رک جانا چاہیے۔گویا رسول وہ درمیانی کڑی ہے جو انسان کو اس کے خالق سے جوڑتی ہے۔اب ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہے کہ کسی بندہ خاص پر خدا کی وحی کس طرح آتی ہے اور یہ کہ موجودہ زمانے میں وہ کون سی وحی ہے جس سے انسان خدا کی حقیقی رضا تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔

چنانچہ اس گھمبیر مسئلہ کو اس مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں انسان نے جو مشینیں اور جو آلات بنائے ہیں وہ تقریباً سب کے سب لوہے کے ہیں۔اگر لوہے کی تاریخ سامنے رکھی جائے تو یہ بات نہایت عجیب معلوم ہو گی کہ انسان نے کس طرح اس کو دریافت کیا جب کہ لوہے کے متعلق اسے پہلے سے کوئی علم نہ تھا۔اس نے

کس طرح اس کے منتشر اجزا کو یکجا کیا جو مختلف مرکبات کی شکل میں زمین کی مختلف چٹانوں کے ساتھ مخلوط ہو کر منتشر پڑے تھے۔ انسان نے انھیں یکجا کیا اور اس کو خالص لوہے کی ٹھوس شکل میں تبدیل کیا۔ یہی حال دوسری ایجادات کا بھی ہے۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ ان ایجادات کی طرف انسانی ذہن کی راہنمائی کس نے کی اور وہ کون سی قوت ہے جو تجربے اور مشاہدے کے دوران ایک سائنس دان کو اس مخصوص نقطے تک پہنچا دیتی ہے جہاں پہنچ کر اسے ایک مفید اور کارآمد نتیجہ حاصل ہوتا ہے جو بات ہم کو معلوم نہ تھی وہ کیسے معلوم ہوگئی اس علم کا ذریعہ وہی خدائی فیضان ہے جس کو ہم وحی کہتے ہیں کہ سب کچھ جاننے والا اپنے علم میں سے تھوڑا سا حصہ انسان کو عطا کر دیتا ہے اور اس کے اندھیرے روشنیوں میں بدل جاتے ہیں بہت سے وجود جو کل تک عدم میں تھے آج وجود میں آ جاتے ہیں یہ فیضانِ وحی کا ابتدائی درجہ ہے جو غیر محسوس طور پہ آتا ہے اور ہر شخص کو اس میں سے حصہ ملتا ہے۔

آپ نے کبھی محسوس کیا ہے کہ آپ کسی راہ پہ جا رہے ہوں پھر خود ہی اندر کی کسی پراسرار ضد سے آپ راہ بدل جاتے ہیں کچھ ہی دیر بعد معلوم ہوتا ہے کہ جس راہ پہ آپ جا رہے تھے وہاں کوئی خوفناک واقعہ پیش آ گیا ہے۔ تب انسان جانتا ہے کہ کسی پراسرار قوت نے اسے اس راہ پہ جانے سے روکا تھا۔ جو اس کے فائدے کی خواہش مند تھی۔ ہزاروں دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان سوچتا کچھ اور ہے مگر وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوتا خود اس کی نظروں کے سامنے اس کے شکستہ ارادوں کا عکس اس کو پریشاں کرتا ہے مگر کچھ وقت گذرنے کے بعد انسان پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اگر اس وقت وہ اپنے ارادوں میں کامیاب جاتا تو اس کو فلاں فلاں نقصان کا سامنا کرنا پڑتا۔ انسان نے مادی دنیا میں جو بیشمار کامیابیاں حاصل کیں ہیں وہ اسی فیضان کا تسلسل ہیں۔ اس نے طرح طرح کی جو ایجادات کی ہیں وہ اس کے اسی تخیل کی پیداوار ہیں جو اس نے اپنے ذہن میں تراشا پھر اس کی عملی تعبیر کے حصول میں مشغول ہو گیا۔ آج کی جدید ایجادات میں سے کسی پر غور کر لیں مثلاً کار اور ہوائی جہاز کی مثال ہی لے لیں کیا اس کے موجد یہ دعوٰی کر سکتے ہیں کہ جہاز اور کار میں انھوں نے کوئی ایسا عنصر استعمال کیا ہو جو ماورائے کائنات ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کار اور ہوائی جہاز اسی کائنات کے منتشر اجزا تھے جنھیں جب ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ اکھٹا کیا گیا تو انھوں نے زمین پر دوڑھنا اور آسمان پر اڑنا شروع کر دیا۔ لوگ اس کو علم سائنس یعنی تجربے اور مشاہدے کا کرشمہ قرار دیتے ہیں مگر میں اس کو اسی خاص علم کے ساتھ مختص کرتا ہوں جو غیب سے ہر آن انسان کی راہنمائی کے درپئے ہے۔ وحی کی دوسری قسم ذرا زیادہ طاقتور اور ترقی یافتہ ہے اس کی خاص بات یہ ہے کہ

اس میں ہر آدمی کو ویسا حصہ نہیں ملتا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ وہ شعوری احساس ہے جو مخصوص لوگوں کے ساتھ خاص ہے۔ یہ وحی صرف ان لوگوں کے پاس آتی ہے جن کے قلوب کو خاص اس مقصد کے لیے تیار کیا گیا ہو اور وہ خاص لوگ اللہ کے وہ نیک اور پسندیدہ بندے ہوتے ہیں جن کو اللہ نے لوگوں کی طرف فلاح کا پیغام پہنچانے کے لیے چن لیا ہو۔ یعنی فریضہ رسالت کے لیے منتخب کر لیا ہو۔ ان کا علم بھی خاص ہوتا ہے اور طریقہ بھی خاص۔ ان کو معروضی علوم (جن کے تحت انسان نے کار اور ہوائی جہاز بنائے) کی بجائے موضوعی علوم عطا کیے جاتے ہیں جن کو حقیقت کا علم یا علم حقیقی بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ انسان کی فلاح کے لیے اللہ کے اس خاص اہتمام میں انسان کو اس رستے تک راہنمائی فراہم کی جاتی ہے جس پر عمل کرنے سے وہ کامیابی کی منزل حاصل کر سکتا ہے۔ پیغمبر انسان کو زندگی گذارنے کا طریق بتاتے ہیں اور حق پہ قائم رہنے کی تاکید و تلقین کرتے ہیں۔

وحی والہام کی اس دوسری قسم کے متعلق بس ہم اسی قدر سمجھ سکتے ہیں اور اس سے زیادہ مطالبہ کرنا دراصل ایک ایسا مطالبہ کرنا ہے جو انسان کے بس سے باہر کی بات ہے۔ مثلاً غور کریں کہ ایک اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کو زمین سے لاسلکی پیغام بھیجا جاتا ہے جس کو ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا آدمی پورے یقین کے ساتھ صاف الفاظ میں سن لیتا ہے یہ ہماری قریبی زندگی کا ایک واقعہ ہے مگر آج تک سائنس اس کی مکمل توجیہ نہیں کر سکی اس سلسلے کی کئی درمیانی کڑیاں ابھی تک غائب ہیں کہ یہ واقعہ کس طرح وجود میں آتا ہے۔ یہی حال ان تمام واقعات کا ہے جن سے ہم اس زمین پر واقف ہیں اب یہ حقیقت واضح ہے کہ ہم حقیقتوں کو صرف مجمل طور پہ جانتے ہیں جیسے ہی ہم کسی حقیقت کو آخری حد تک سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ہماری قوتیں جواب دینے لگتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی کلی حقیقت کو سمجھنے کا مطالبہ کرنا کسی ایسے آدمی کا کام ہی ہو سکتا ہے جو خود اپنی حقیقت سے بے خبر ہو۔ سائنس نے بھی اب اس امر کو طوعاً و کرہاً تسلیم کر لیا ہے کہ حقیقت کے متعلق آخری علم حاصل کرنا انسان کے بس سے باہر کی بات ہے۔ اس سلسلے میں برطانوی مفکر (Heisen Berg) کی تازہ کتاب (Modern Scintefic Thought) سے ہم وہ اصول بیان کریں گے جس کو انھوں نے اصول عدم تعین (The Principle of Indeterminacy) کا نام دیا ہے۔ اس اصول کا عمومی تصور یہ ہے کہ قدیم زمانے میں اہل سائنس کا خیال یہ تھا کہ کائنات کی بسیط پہنائیوں میں اگر کسی ایک ذرے (ایٹم) یا ایک الیکٹران کا مقام مکمل طور معلوم ہو۔ اگر ہم یہ جان لیں کہ کسی خاص وقت میں فضاء کے اندر اس کا مقام اور رفتار کیا ہے اور اگر ان معلومات کے ساتھ بیرونی طور پہ اثر انداز ہونے والی طاقتوں کا

علم بھی حاصل ہو جائے تو الیکٹران کے تمام مستقبل کو متعین کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر کائنات کے تمام ایٹموں کے متعلق ان باتوں کا علم حاصل ہو جائے تو ساری کائنات کے بارے میں آنے والے وقت کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ مگر ہائزن برگ کی تشریح کے مطابق جدید سائنس اب اس نتیجے تک پہنچی ہے کہ ان مقدمات کی دریافت میں بہت سے قوانین قدرت حائل ہیں اس لیے کہ اگر ہم یہ جان بھی لیں کہ ایک خاص الیکٹران اس وقت فضاء میں کس خاص مقام پر موجود ہے تب بھی ہم ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے کہ وہ کس رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ قدرت ہمیں کسی حد تک سہو (Margin of Error) کی اجازت دیتی ہے مگر جب ہم اس گنجائش میں گھسنا چاہیں گے قدرت ہمارا راستہ روکے گی اور قوانین فطرت ہماری کوئی مدد نہیں کریں گے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت انسان ہی کی طرح بالکل صحیح پیمائشوں سے قطعاً نا آشنا ہے اسی طرح اگر ہمیں فضاء میں کسی الیکٹران کی حرکت کی ٹھیک ٹھیک رفتار معلوم ہو تو قدرت ہمیں فضا کے اندر اس کا صحیح مقام دریافت نہیں کرنے دیتی اور اگر ہم فضاء میں کسی الیکٹران کا درست مقام معلوم کر لیتے ہیں تو قدرت اس کی رفتار کو ہم سے چھپا لیتی ہے گویا الیکٹران کا مقام اور اس کی حرکت کسی پرانی لالٹین کی سلائیڈ کی دو مختلف سمتوں پر نقش ہیں اگر ہم سلائیڈ کو کسی خراب لالٹین میں رکھیں تو ہم ان دو رخوں کے درمیان کے نصف کو روشنی میں لا سکتے ہیں اور الیکٹران کے مقام اور اس کی حرکت دونوں کو کچھ نہ کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ اچھی لالٹین کے ذریعے ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم ایک سلائیڈ پر جتنی زیادہ روشنی ڈالیں گے دوسری اتنی ہی دھندلی ہوتی چلی جائے گی چنانچہ سچ یہ ہے کہ خراب لالٹین قدیم سائنس ہے جس نے صدیوں انسان کو اس فریب میں مبتلا رکھا کہ اگر ہمارے پاس مکمل لالٹین ہو تو ہم کسی خاص وقت پر ذرے کے مقام اور اس کی رفتار کا ٹھیک ٹھیک تعین کر سکتے ہیں یہی دھوکہ تھا جس نے سائنس میں جبریت (Determinism) کو داخل کیا۔ مگر اب جب کہ جدید سائنس کے پاس زیادہ بہتر لالٹین موجود ہے تو اس نے ہمیں بتایا کہ کسی بھی ایٹم کی حالت اور حرکت کا تعین حقیقت کے دو مختلف پہلو ہیں جنھیں ہم بہ یک وقت روشنی میں نہیں لا سکتے اس سلسلے کا آخری سوال یہ ہے کہ خدا کی وحی جو مختلف زمانوں میں انسان کے پاس آتی رہی ہے ان میں سے کون سی وحی ہے جس کی پیروی آج کے انسانوں کو کرنی ہے اس کا جواب بالکل سادہ ہے کہ بعد کے لوگوں کے لیے وہی وحی قابل اتباع ہو سکتی ہے جو سب کے بعد آئی ہو۔ مثلاً کوئی حکومت ایک ملک میں کسی شخص کو اپنا سفیر بنا کر بھیجتی ہے ظاہر ہے کہ اس شخص کی سفارت اسی وقت تک کے لیے ہے جب تک وہ اس عہدے پر باقی ہو۔ جب اس کی مدت کار ختم ہو

جائے گی اور کسی دوسرے شخص کو اس عہدے پر معمور کر دیا جائے گا تو اس کے بعد وہی شخص حکومت کا نمائندہ تصور ہوگا جس کو سب سے آخر میں نمائندگی کا موقع دیا گیا ہو۔ اس اعتبار سے حضرت محمد ﷺ ہی وہ آخری رسول ہیں جو آج اور قیامت تک کے لیے انسانیت کے راہنما ہیں جو چھٹی صدی عیسوی میں عرب سے اٹھے تھے اور جن کے بعد کوئی نبی ہوا اور نہ آئندہ کوئی نبی ہوگا۔ آپ ﷺ کا تمام نبیوں کے بعد تشریف لانا اس بات کی کافی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کو ہی حال اور مستقبل کے لیے خدا کا نمائندہ قرار دیا جائے کیونکہ بعد کو آنے والا اپنے سے پہلے آنے والوں کو منسوخ کر سکتا ہے مگر پہلے آنے والا بعد میں آنے والے کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ہم ان تمام نبیوں کو مانتے ہیں جو خدا کی طرف سے انسانوں کی طرف آئے ان میں سے کسی کا بھی ہم انکار نہیں کرتے کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے رسولوں میں تفریق نہ کرو۔ مگر ظاہر ہے کہ اطاعت اور پیروی تو صرف وقت کے نبی ہی کی جا سکتی ہے۔ محمد ﷺ کے بعد کسی اور نبی کا ظاہر نہ ہونا اور اللہ کی طرف سے اس اعلان کے بعد کہ محمد ﷺ ہی اس کے آخری رسول ہیں اس بات کی علامت ہے کہ اب آپ ﷺ ہی وقت کے نبی ہیں اور اب تمام انسانوں کو آپ ﷺ ہی کی پیروی کرنی ہے۔

جب کوئی نبی آتا ہے تو وہ دراصل اپنے وقت کے لیے خدا کا حکم ہوتا ہے اور وقت کے نبی کو چھوڑ کر اس سے پہلے گذرے کسی بنی کی اطاعت کا دعویٰ کرنا خدا پرستی نہیں بلکہ خود پرستی ہے اور ایسا شخص خدا کے ہاں وفاداروں میں شمار نہیں ہوگا بلکہ اسے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا اور خود تاریخ کے وہ رسول ان سے اعلان برأت کریں گے جن کی پیروی کا آج وہ دعویٰ کر رہا ہے۔ جیسے کہ آج کے یہود، ہنود اور نصاریٰ کا طرزِ عمل یہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انسانی تاریخ کی سب سے پرانی اور مذہبی کتاب رگِ وید ہو جو خدا کی ہدایت کے تحت مرتب کی گئی ہو جیسا کہ انجیل نسبتاً درمیانی زمانے کی الہامی کتاب ہے مگر اب یہ سب کتابیں بوسیدہ (Out of Date) ہو چکی ہیں اس سے قطع نظر کہ ان کے مضامین کی صحت مشکوک ہے اور اس سے قطع نظر کہ ان میں سے کوئی کتاب بھی خود کو آخری اور دائمی کتاب کی حیثیت سے پیش نہیں کرتی صرف یہ واقعہ کہ وہ خدا کے آخری ہدایت نامے سے پہلے نازل کی گئیں ہیں اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ان کو آج منسوخ قرار دیا جاتا ہے۔ کوئی شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ میں آخری نبی محمد ﷺ پر کیوں ایمان لاؤں اور یہود نصاریٰ ایسے ہی کہتے ہیں تو ان کے لیے یہ سادہ سی دلیل کافی ہے کہ جن وجوہ اور دلائل کی بنا پر آپ دوسرے رسولوں کو رسول مانتے ہیں انھیں وجوہ اور دلائل کی بنا پر ان کو محمد ﷺ پر بھی ایمان لانا پڑے گا اور لوگ کسی دوسرے رسول کے بارے میں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ خدا کا حقیقی نمائندہ ہے جو اصول بھی وہ بنائیں گے اور جو مقدمات

بھی قائم کریں گے ٹھیک انھیں دلائل اور انھیں مقدمات کی بنا پر ان کو محمد ﷺ کو بھی خدا کا رسول اور نمائندہ ماننا ہوگا اور اگر کوئی آخری رسول ﷺ کا انکار کرتا ہے تو اس کو اللہ کے سارے رسولوں کا انکار کرنا پڑے گا اور اگر کوئی اللہ کے دوسرے رسولوں پر ایمان رکھے تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اللہ کے آخری پیغمبر محمد ﷺ پر بھی ایمان لائے۔

اور جب کوئی نبی ﷺ پر ایمان لا کر دین اسلام میں داخل ہوتا ہے تو لامحالہ اس کو اس بات کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ محمد ﷺ ہی آخری سند ہیں۔ محمد ﷺ کو رسول ماننا ان پر ایمان لانا اور آپ ﷺ کو آخری سند قرار نہ دینا ایک ایسا تضاد ہے جس کی اخلاق معاشرت اور مذہب میں کوئی گنجائش نہیں اور خدا کے آخری حکم کی موجودگی میں سابقہ حکموں کا حوالہ دینا خدا کی اطاعت کا ایک ایسا طریقہ ہے جس سے خدا کبھی راضی نہیں ہوسکتا۔ یہ خود اپنے نفس کی اطاعت ہے نہ کہ خدا کی اطاعت۔ چنانچہ نفس کی اس خواہش نے دنیا میں ایک بہت بڑے بگاڑ کو جنم دیا جس کی وجہ سے لوگ ٹکروں اور قوموں میں بٹ کر رہ گئے۔ حالانکہ نبی ﷺ کو تمام دنیا کی طرف رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے مگر لوگوں نے قرآن کے سائے میں پناہ ڈھونڈنے کے بجائے اپنے نفس کی خواہش کو غالب رکھا جس کی وجہ سے نہ صرف اس کی انفرادی زندگی میں بلکہ قوموں کی اجتماعی زندگی میں بھی فساد اور بے چینی کا وہ جذبہ پیدا ہوا جس نے کرہ ارض کا چہرہ لہولوہان کر رکھا ہے۔ آج قومیت مذہب اور معیشت پر دنیا بھر میں شدید تصادم بپا ہے اگر انسان کائنات میں اپنے مقام اور راستی کے افکار پر نظر رکھتا تو خطہ ارض پر کبھی یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی اور انسان امن وسکون کی اس دنیا سے آشنا ہوتے جس کا آج وہ تصور بھی نہیں کرسکتا۔ تخلیق کے بارے میں خدا کا منصوبہ ایک کامل منصوبہ ہے اور انسان کے سوا بقیہ کائنات ٹھیک ٹھیک خالق کی منشا کے مطابق اپنے افعال سرانجام دے رہی ہے۔ اس لیے ساری کائنات درست حالت میں ہے اور اس میں دور دور تک کہیں کوئی خرابی نہیں ہے۔ مگر انسان چونکہ اپنے عمل میں آزاد ہے اس لیے وہ حق کو چھوڑ کر اپنی خواہش پر چلتا ہے اسی لیے اس کی دنیا سے سکون وآشتی غائب ہے۔ چنانچہ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسانی معاشروں کا بگاڑ دراصل انسان کی آزادی کی قیمت ہے۔

انسان کے مسائل کا حل اسلام کے نزدیک وہی ہے جو بقیہ کائنات کے مسائل کا حل ہے۔ انسان اپنی خواہش پر چلنے کی بجائے اگر اسی حق پر چلے جس پر کائنات کی بقیہ تمام قوتیں چل رہی ہیں تو اس کے سماج میں بھی وہی اصلاح اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی جو بقیہ کائنات میں ہر وقت موجود ہے۔ خدا کے منصوبے کے مطابق خدا کا قانون ہے جس میں عدل کا وہ معیار ہے کہ اس کو اپنا لینے کے بعد فساد دب کر رہ جاتا ہے اور انسان کے ہر

طرف خیر کا غلبہ نظر آتا ہے اگر چہ ایک تصوراتی سماج کی تیاری کے لیے اہل فلسفہ اور علوم سماجیات کے ماہرین نے بے پناہ کاوشیں کی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ خالق ہی اس بات کا اصلی حق دار ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے لیے زندگی کے دائرے متعین کرے اور قرآن انھیں دائروں اور سماجی قوانین کو انسان تک پہنچاتا ہے جن پر عمل کر کے وہ ایک ایسے سماج کی تعمیر کر سکتا ہے جس میں خیر کا غلبہ اور شر کو ذلت کا مقام حاصل ہوگا۔ خدا کا قانون ہے کہ ہر ایک اپنے دائرۂ عمل میں رہے ہم دیکھتے ہیں کہ سورج چاند زمین سمیت تمام اجرام فلکی اسی حکم پر عمل پیرا ہیں یہی وجہ ہے کہ لاکھوں کروڑوں سال گذر گئے مگر ان میں سے کوئی کبھی دوسرے کے مدار میں داخل نہیں ہوا اور نہ کبھی وہ ایک دوسرے سے ٹکرائے ہیں۔ اگر اسی حق کا اطلاق انسان پر کیا جائے اور ہر انسان اپنے دائرہ عمل کو متعین کرتے ہوئے اس امر کا لحاظ رکھے کہ اس سے کسی کی حق تلفی نہ ہو تو اس کا سماج درست ہوتا چلا جائے گا۔ اس کے برعکس اگر انسان اپنی خواہش پر چلنے لگے تو پھر انسانی معاشروں کی ایسی ہی صورت نظر آئے گی جیسا کہ آج کل دنیا کی حالت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مادیت اور مسابقت کے ان معاشروں نے انسان سے ان کی بنیادی اخلاقی اقدار تک چھین لی ہیں۔ خالق کی پہچان اور معرفت تو دور کی بات ہے آج کا انسان تو اپنی ناک سے آگے دیکھنے کا روادار نہیں۔ وہ کن منزلوں کا راہی ہے خود اس کو بھی نہیں معلوم۔ مگر اس کے باوجود اس کی سانس پھول رہی ہے وہ کسی اجنبی سراب کی طرف اپنی پوری توانائیوں سے بھاگ رہا ہے اور یونہی اس بھاگ دوڑ میں جانے کب زندگی کی شام ہو جائے اس کو کوئی پرواہ نہیں کہ آج کا دور (Flux of information) کا دور ہے جس نے معلومات کا ایک سیلاب پیدا کر دیا ہے اور علم کہیں پس منظر میں چلا گیا ہے اور یہی آج کے انسان کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے؟؟؟



کائنات کا فلسفیانہ تصور

قدیم زمانے میں انسان کے ذہن پر فلسفے کا غلبہ تھا، علم فلسفہ چیزوں کو مکمل طور پہ سمجھنے پر زور دیتا ہے۔ وہ اشیاء کے ظاہر سے گذر کر اس کے باطن تک پہنچنا چاہتا ہے۔ تاہم پانچ ہزار سالہ انسانی کوششوں کے باوجود فلسفہ کو اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ فلسفہ نے کائنات اور زندگی کی جو تشریحات کیں اگر چہ ایک زمانے تک لوگوں میں مقبول رہیں تاہم خود اہل فلسفہ اور ان کے نظریات زمانے کے ارتقاء کا شکار رہے۔ اس لیے کوئی فلسفہ کائنات اور زندگی کی حتمی تشریح تک نہ پہنچ سکا۔ مگر جب خالق نے اپنے علم سے انسان کی راہنمائی فرمائی تو انسان نے نہ صرف مقصدِ زیست کو جانا بلکہ زندگی کے پس منظر میں پھیلے ان تمام مظاہر کائنات کے حقیقی تصور تک بھی اس کو رسائی حاصل ہوگئی جو صدیوں تک انسان کے لیے ایک لایعنی دردسر کا باعث بنے رہے۔ فلسفے کے قبول ورواج کے ساتھ انسان نے توہم کے اس چنگل سے نجات پائی جسے وہ مذہب کہتا چلا آیا تھا۔ جب مظاہر کائنات کی فلسفیانہ تشریحات سامنے آنے لگیں تو انسان نے بھی ان کو معبود ماننا چھوڑ دیا اگر چہ حقیقی معبود تک رسائی ابھی اس کی پہنچ سے ذرا پرے تھی مگر اس نے اپنے سماجی اور تمدنی رویوں میں

تبدیلی کا کافی سفر طے کیا جس نے اس کے تصورِ معبود کو بھی متاثر کیا اور قدیم عقائد جیسے روحوں کا مت وغیرہ کے اثرات بتدریج کم ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ مادیت پسندی کی لہر اور سائنسی دور کی ابتدا کے ساتھ بالکل ہی ناپید ہو گئے۔ سائنس اور مادیت پسندی میں شروع ہی سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور یہ جدیدیت کے حامی تصورات پر مبنی رہے ہیں اور ان کی رو سے عالم کو حقیقی مانا گیا ہے۔ سائنس میں مشاہدے اور تجربے سے کام لے کر ان کی روشنی میں نظریات مرتب کیے جاتے ہیں اور مادیت پسندی میں حسیات اور مدرقات کے وسیلے سے تجریدات اور معقولات اخذ کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ مثالیت پسندوں نے حقیقت کبریٰ کو وجودِ متعلق یا شعورِ متعلق یا عین العیون کو جو اِن کی فکری کاوشوں کا حقیقی مقصود منتہا ہے خدا کا نام دیا ہے۔

مگر مثالیت پسندوں کے وجودِ متعلق یا خدا اور اہل مذہب کے خدا میں یہ فرق ہے کہ مثالیت پسندوں کا وجودِ متعلق یا خدا واجب الوجود ہے اور شخصی ہے جب کہ اہل مذہب کا خدا ایک ذی ارادہ ہستی ہے جو انسان ہی کی طرح جذبات و احساسات رکھتا ہے اور کائنات میں ہر وقت ہر قسم کا تصرف کرنے پر قادر ہے۔ مزید براں مثالیت پسند بھی اہل مذہب کی طرح روح اور اس کی بقاء کے قائل ہیں اور انسان کو فاعل مختار مانتے ہیں فلاسفہ کا مذہبی تصور یہ رہا ہے کہ عہد قدیم کے عقائد جادو دیو مالا اور دیگر مذہبی تصورات روحوں کے مت سے ماخوذ ہیں۔ جادو اس مفروضے پر مبنی ہے کہ انسان کی زندگی پر چند نیک یا بد ارواح کا تسلط ہے چنانچہ جادوگر اپنی نیک روحوں سے کام لے کر انسان کو بد روحوں کے آزار سے محفوظ کرتے اور خبیث روحوں پر قبضہ کر کے ان کو اپنے دشمنوں کی ایذا رسانی کے لیے استعمال کرتے۔ زمانہ گذرنے کے ساتھ مظاہر کائنات یعنی سورج چاند، ستاروں دھرتی وغیرہ کی پوجا بھی شروع ہو گئی مگر ان کی پوجا اس نظریے کے تحت کی جاتی کہ وہ روشنی حیات ، زرخیزی اور افزائش کے پاسبان تھے علاوہ ازیں ان کے ہاں موت، تاریکی، گرہن، رعد، زلزلے، آتش فشاں اور پہاڑوں وغیرہ کے خوفناک دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بھی قربانی دی جاتی تا کہ وہ ان کے درپئے آزار نہ ہوں۔

چنانچہ اہل فلسفہ مانتے ہیں کہ مذہب روحوں کے مت ہی کی منظّم صورت ہے جس میں انسان نے زندگی کے مصائب وحوادث، موت اور امراض کی دہشت اور اس بے کراں کائنات میں اپنی بے چارگی اور بے بسی کے تلخ احساس سے پناہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے ایک یا ایک سے زائد فوق الطبع ہستیوں کا سہارا لیا۔ یہی وہ دور تھا جب انسانوں کے ایک گروہ نے شعوری طور پہ مذہب سے بغاوت کا نظریہ اپنایا کہ اُن کا خیال تھا مذہبی نظریات چونکہ عقلی اساس پہ استوار نہیں ہوتیں اس لیے لوگوں کو عقل کی

روشنی میں اپنی زندگی کی راہوں کا تعین کرنا چاہیے۔اس تحریک کو چونکہ بہت سے صاحب عقل و دانش لوگوں کی پشت پناہی بھی حاصل ہوگئی اس لیے لوگوں نے اس نظریہ زیست کو اپنا لیا۔اسی کو خرد افروزی کی تحریک کہا جاتا ہے۔فرانس میں ''Kamoos'' نے انگلستان میں ''Gubban'' اور ''Hehoom'' نے اعلانیہ روایتی مذہب کے خلاف آواز بلند کی اور خدا روح اور حیات بعد موت کا برملا انکار کیا۔وہ سائنس کی روشنی میں ایک نیا مذہب وضع کرنا چاہتے تھے جو الہام اور وحی سے مبّرا ہو۔روسو ہی سے خرد دشمنی کی روایت کا آغاز ہوا جس کی ترجمانی بعد میں فختے، نٹشے، شوپن ہائر اور برگساں جیسے بڑے اہل دانش نے کی۔اہل مذہب اور مثالیت پسند قدم قدم پر سائنس اور مادیت کی مخالفت کرتے رہے۔نشاۃ الثانیہ کی صدیوں میں کلیسا نے سائنس کی اشاعت کو روکنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔تحریک اصلاح کلیسا بھی نشاۃ الثانیہ ہی کی ایک فرع تھی جس نے پاپائے روم کے ذہنی استبداد کا جوا اتار پھینکا۔پھر سائنس کی ترویج اور اصلاح کلیسا کی تحریکوں کو کچلنے کے لیے احتساب کا محکمہ قائم کیا گیا اور یسوعیوں نے بجبر و اکراہ تحقیقی علوم کے استیصال کی کوشش کی۔لیکن اب سائنس کے رواج و قبول کو روکنا ان کے بس کی بات نہ تھی کلیسا کا جبر کم ہوا اور سترہویں صدی اہم انکشافات اور ایجادات کی صدی بن گئی۔

اٹھارویں صدی کی تحریک خرد افروزی سائنس کے فروغ کا منطقی نتیجہ تھی۔قاموسی خردمندوں کی تحریریں بڑی مقبول ہوئیں۔خرد افروزی کے ہمہ گیر اثرات کو زائل کرنے کا بیڑہ جرمن فلسفی Cont نے اٹھایا جو روسو کا بہت بڑا مداح تھا اور جسے جرمن رومانیت کا باپ سمجھا جاتا ہے۔جرمن رومانیت پسندوں کو روسو کے روحانی بچے کہا کرتے۔رومانیت کے دو بڑے اجزائے ترکیبی یہ ہیں۔اول خرد دشمنی، دوم انا پرستی یا فردیت۔رومانی ادب میں جذبات اور احساسات کے بے محابہ اظہار پر زور دیا گیا ہے اور وہ کلاسیکی ادب کی اسلوبی بندشوں سے باغی تھے۔چنانچہ گوئٹے، شلر لسنگ، ہرڈر، بائرن، وڈزورتھ اور شیلے کا شمار رومانیت کے مشہور شارحین میں کیا جاتا ہے۔فلسفے میں اس کی ترجمانی موضوعیت اَنا پرستی اور خرد دشمنی کی صورت میں کی گئی۔تحریک روما نیت کا فکری پس منظر یہ ہے کہ قدمائے یونان انسان کو مرکز کائنات سمجھتے تھے کیونکہ بطلیموسی نظام ہیئت کی رو سے سورج کرہ ارض کے گرد گھومتا ہے جب کہ کوپرنیکس نے ثابت کر دیا کہ کرہ ارض کائنات کا مرکز نہیں بلکہ نظام شمسی کا ایک حقیر سیارہ ہے تو انسان کی اَنا کو سخت ٹھیس لگی اس ذہنی صدمے کے اندمال کے لیے ایک رومانی فلسفہ وجود میں آیا کہ کائنات کا وجودِ متعلق یا شعورِ متعلق واحد حقیقت ہے جو انسان کے ذہنی شعور سے معنوی مماثلت رکھتا ہے۔اس طرح گویا شعور کے حوالے سے دوبارہ انسان کو ہی مرکز کائنات قرار دے دیا

گیا۔ جرمن مثالیت پسندوں نے اس دلیل کو انتہا تک پہنچا دیا (well deurant) نے لکھا ہے کہ کانٹ سے قبل ہی ایک بشپ بار کلے نے مذہبی نقطۂ نظر کو تقویت دینے کے لیے کہا تھا کہ کائنات میں صرف مدرکات موجود ہیں اور مادے کا کوئی وجود نہیں۔ پھر بار کلے کی طرح Cont نے بھی مثالیت کے حوالے سے مذہبی اعتقادات کی بحالی کی کوشش کی۔ کانٹ نے قدمائے یونان کی طرح ظاہری عالم اور حقیقی عالم کی تفریق کی۔ اس کے خیال میں زمان ومکاں کا عالم جس سے سائنس کا رابطہ ہے عالم ظواہر ہے مگر عالم حقیقی تک رسائی پانا خرد یا سائنس کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ عقل وخرد جب عالم حقیقی کے بارے میں سوچنا چاہتی ہے تو تضاد کا شکار ہو جاتی ہے۔ راز یہ ہے کہ عالم حقیقی صرف اہل مذہب ہی پر منکشف ہو سکتا ہے اور ہم ذات خداوندی قدر واختیار اور بقائے روح کی توثیق عقلی استدلالی سے کر ہی نہیں سکتے۔ اس مقصد کے لیے اخلاقی وجدان کو بروئے کار لانا لازم ہوگا۔ تمام اہل مذہب کی طرح کانٹ نے بھی سائنس کی جبریت کو یہ کہہ کے رد کر دیا کہ کسی بھی اخلاقی عامل کے لیے ذی اختیار ہونا ضروری ہے۔ کانٹ کا نظریہ بنیادی طور پہ مثالیاتی ہے لیکن وہ مثالیت پسند کہلوانا پسند نہیں کرتا اور اپنے فلسفے کو تنقیدی فلسفہ کہتا ہے Cont کو لا ادری (Agnostic) بھی کہا گیا ہے۔

کیونکہ اس کے خیال میں عقل کی رسائی حقیقت نفس الامری تک نہیں ہو سکتی وہ کہتا ہے کہ ہمارے ذہن کی ساخت ہی ایسی ہے کہ ہم حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں۔ کانٹ نے دے کارت کی موضوعیت کو قبول کر لیا اور کہا کہ زمان ومکاں کا کوئی معروضی وجود نہیں ہو سکتا یہ تصور ہمارے ذہن نے خلق کیا ہے اور اس کے وجود کا انحصار ذہن پر ہی ہے۔ کانٹ کی رومانی مثالیت پسندی اور مذہب میں بہت سے اساسی اصول مشترک ہیں۔ مثلاً کانٹ نے ذات باری تعالیٰ اور روح کے وجود بقاء اور قدر واختیار کے بارے میں دلائل دیئے ہیں اور دونوں میں اخلاقی وجدان کو ادراکِ حقیقت کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ کانٹ کی لاادریت وہی ہے جو اہل مغرب کی خرد دشمنی سے متبادر ہوتی ہے اس نے یہ کہہ کر مذہب کو تقویت دی کہ حقیقت نفس الامری کا انکشاف عقل وخرد پر نہیں ہوتا۔ اس نے اہل مذہب کی طرح عالم ظواہر اور عالم حقیقی میں فرق کیا اور کہا کہ حقیقی عالم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سائنس کا طریق تحقیق ناکام رہتا ہے جب کہ مذہبی وجدان اسے پا لیتا ہے۔ پھر دونوں کا الٰہیاتی نظریہ تشبیہی ہے۔ مذہب میں خدا کو انسانی شکل و صورت اور احساس وجذبہ پر قیاس کیا گیا ہے مگر کانٹ کی مثالیت پسندی میں کائنات کو انسان پر قیاس کیا گیا ہے وہ کہتا ہے کہ کائنات بھی انسان کی طرح ذہن واحساس سے مزین ہے اور کائناتی ذہن اور انسانی ذہن

دونوں واحد النوع ہیں۔تاہم کانٹ کا جو نظریہ ''تنقید عقل محض'' میں پیش کیا گیا ہے اسے موضوعی مثالیت کہنا زیادہ قرین صحت ہوگا قدمائے یونان کی مثالیت پسندی اور جرمنی کے رومانی فلاسفہ کی مثالیت پسندی میں فرق ہے۔ یونان کے مثالیت پسند فلاسفہ افلاطون اور ارسطو وغیرہ عقل استدلالی پر محکم یقین رکھتے ہیں۔ افلاطون اور پارمی نائدس کا اِدّعا یہ ہے کہ صرف عقل اور استدلال ہی عالم حقیقی تک رسائی حاصل کرسکتی ہے اس کے برعکس کانٹ عقل استدلالی کو چنداں اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں اس لیے کہ وہ ادراکِ حقیقت سے قاصر ہے اس طرح کانٹ کے واسطے سے رومانی فلسفے میں خرد دشمنی نے بار پایا۔کانٹ کی مثالیاتی روایت کی ترجمانی فختے، شیلنگ اور ہیگل نے کی ہے لیکن ایک امر خاص میں انھوں نے کانٹ کے نظریہ سے انحراف کی راہ اپنائی ہے۔انھوں نے کانٹ کی لا ادریت کو رد کردیا اور کہا کہ عقل انسانی حقیقت نفس الامری کو جاننے پر قادر ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ حقیقت کامل واکمل وحدت ہے جس کا ادراک صرف عقل استدلالی ہی کرسکتی ہے۔انھوں نے بھی روح متعلق، وجود متعلق یا عین متعلق کو خدا کہا ہے۔فختے کا وجود مطلق اخلاقی ہے شیلنگ کا جمالیاتی اور ہیگل کا عقلیاتی ہے۔اس اختلاف کے باوصف فلسفیانہ وحدت الوجودان میں قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہے فختے نے وجود متعلق کو اَنائے مطلق کہا ہے جو روحانی الاصل ہے۔غیر شخصی فعلیت ہے اور کائنات میں ہر کہیں جاری وساری ہے اور تمام اَناؤں کا مبدأ اور مآخذ بھی وہی ہے۔فختے کہتا ہے کہ حقیقی وجود اَنا کا ہے۔عالم مادی جو ہمیں بظاہر دکھائی دیتا ہے اسے اَنائے مطلق نے ہی خلق کیا ہے تاکہ اس سے پیکار آزما ہو کر وہ اپنی تکمیل کر سکے۔فختے کے اس نظریے میں مثالیت پسندی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔یعنی وہ کہتا ہے کہ کائنات کی اصل ذہن ہے۔روحانی ہے، فختے نے کائنات میں ذہن اور مادے کی دوئی سے انکار کیا ہے اور کائنات سے مادے کو یکسر خارج کردیا ہے کہ کائنات فی الاصل ذہن ہے۔اَنا ہے، خدا ہے، فختے کا فلسفہ مثالیاتی انداز میں مذہب کی توثیق کرتا ہے اور صوفیانہ وحدت الاوجود کی یاد دلاتا ہے۔

فختے بھی اہل مذہب کی طرح انسانی قدر واختیار اور روح کی بقاء کا قائل ہے۔البتہ اس کے خیال میں وہی روح یا اَنا باقی رہے گی جو فطرت کے خلاف نبرد آزما ہو کر توانا ہو جائے گی اور یہ پیہم کشمکش ہی روح کو غیر فانی بنا سکتی ہے۔ہمارے ہاں اقبال نے فختے کے اس فلسفے کو خودی کے نام سے اسلام کا جامہ پہنایا۔شیلنگ بھی فلسفیانہ رومانیت کا شارح ہے اس کا وجودِ مطلق جمالیاتی ہے اور اس کا تصور کائنات یہ ہے کہ کائنات ایک نہایت حسین وجمیل فن پارہ ہے جو ایک اعلیٰ فنکار کی صناعی اور اہلیت کا ثبوت ہے۔یہی نقطہ نظر'' گوئٹے، شلر

اور وڈزروتھ" وغیرہ رومان پسندوں کا بھی تھا۔ البتہ شیلنگ کے فلسفے کو وحدت الوجود بھی کہا گیا ہے کیونکہ اس کے خیال میں وجود مرئی روح ہے جب کہ نیچر غیر مرئی روح ہے۔ اسی خیال کو وڈزورتھ، لسنگ اور ہرڈر وغیرہ نے آگے بڑھایا جس سے رومانیوں نے کسب فیض کیا۔ انھوں نے نیچر کو ذی حیات اور ذی روح کہا اور پھر اس سے ذہنی و قلبی رابطہ قائم کرنے کی دعوت دی۔ آخری عمر میں شیلنگ پکا صوفی بن گیا تھا اور کہنے لگا تھا کہ روح بالآخر روحِ مطلق میں فنا ہو جاتی ہے۔ ہیگل اوائل عمری میں تصوف کی جانب مائل تھا وہ روسو اور کانٹ کے نظریہ کائنات سے خاص طور پہ متاثر تھا۔ اس نے تصوف سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وجودِ متعلق کے علاوہ جو شئے بھی ہے وہ غیر حقیقی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سوائے کُل کے کوئی حقیقی شئے نہیں ہو سکتی۔ اس کے فلسفہ میں کائناتِ ذہن کا ارتقاء نیچر کی طرف ہے جو اعمال انسانی ذہن میں وارد ہوتے ہیں وہی نیچر میں بھی واقع ہوتے ہیں۔ نیچر میں یہ عمل لاشعوری طور پہ ہوتا ہے۔ جیسے بیج کا پھول بن جانا، انسان میں یہ عمل شعوری ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ ارتقاء کے مراحل سے گذر رہا ہے۔ چنانچہ ہیگل کی کائنات "وہ کُل" ہے جو ایک فکری عمل ہے اور کسی فکری عمل ہی کی طرح ارتقاء پذیر ہے اور اسی کو کامل مثالیت کہا جاتا ہے۔

اس کل میں جدلیاتی عمل جاری ہے یعنی مثبت منفی اور اتحاد کا عمل جس میں قدریں محفوظ رہتی ہیں۔ یہ عمل افکار میں جاری ہے لہٰذا کائنات بھی اصلاً فکری ہے اور فکری قوانین کے تحت ہی ارتقاء پذیر ہے۔ کُل نیچر اور انسان دونوں کو محیط ہے۔ بعد کے ادوار میں ہیگل کے اس فلسفہ کائنات کی اس کے شاگردوں نے مزید تشریح کی۔ ہیگل کے پیروؤں میں بریڈلے، رائس، کروچے، جنٹلے اور اوبکن کو شمار کیا جاتا ہے جنہوں نے اس فلسفے کی تشریح کرتے ہوئے لکھا کہ مادہ ذہن کی تخلیق ہے اور اپنے وجود کے لیے ذہن ہی کا محتاج ہے۔ ہیگل اور اس کے پیرو عقلیت پسند ہیں یعنی ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عقل استدلالی مشاہدے اور حسی تجربے کے بغیر بذات خود صداقت کا انکشاف کر سکتی ہے۔ مثالیت پسندی کے اس پہلو سے بھی مذہب کی تائید و توثیق کا کام لیا گیا ہے۔ چونکہ مذہب کی صداقتیں بھی انسانی تجربے سے ماوراء ہوتی ہیں اس لیے ہیگل کے ناقدین ہربارٹ، ولیم جیمز اور فوئرباخ وغیرہ کہتے ہیں کہ عقلیاتی استدلال کے لیے بہرحال کسی بنیاد کی ضرورت ہے جس کے بغیر مجرد عقل استدلالی انسانی تجربے سے ماوراء ہو کر کوئی موضوع فراہم نہیں کر سکتی۔ علم کے دو پہلو ہیں ہیت اور موضوع مگر عقلیت پسند صرف ہیت سے اعتناء کرتے ہیں۔ لیکن ہیت بغیر موضوع کے کھوکھلی ہے جیسے موضوع کے بغیر ہیت انتشارِ محض ہے۔ مگر علم نہ کھوکھلا ہے نہ انتشار، اس لیے تجربہ اور مشاہدہ موضوع فراہم کرتے ہیں اور عقل استدلالی اس میں نظم قائم کرتی ہے اور تجربہ اور عقل مل کر ہی کسی موضوع کو منظّم کرتے ہیں

اور علم اسی تنظیم کا دوسرا نام ہے۔ یونانِ قدیم میں سوفسطائیوں نے حیات کے حق میں بات کی تھی اور کہا تھا کہ انسان حسی تجربے کے واسطے سے ہی علم حاصل کر سکتا ہے۔ تاہم جدید دور میں بیکن ، لاک ، ہربارٹ ، آگسٹس ،کونٹ اور ولیم جیمز وغیرہ نے اس فکری رویے کے حق میں دلائل دیئے ہیں اور تجربیت ،نتائجیت ، ایجابیت اور حقیقت پسندی کی تحریکوں کی آبیاری کی جس سے بالواسطہ سائنس کے نقطہ نظر کو تقویت پہنچی۔ ہیگل کے فلسفے میں کائنات ارتقائی عمل ہے جس میں خدا عقل محرک کی حیثیت رکھتا ہے اور کائنات کے ارتقائی عمل میں شریک ہے۔ اس پہ یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ہیگل کا خدا اگر شروع ہی سے کامل واکمل تھا تو ارتقاء کے عمل میں کیسے شریک ہوا۔ اور اگر وہ کائنات کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ صورت پذیر ہو رہا تھا تو اسے کامل کیسے کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہیگل اور اس کے متبعین کائنات کو ایک عظیم ذات تصور کرتے ہیں جس کی ماہیت ذہنی ہے اور وہ اس کائنات کو بامعنی کہتے ہیں۔ یعنی اس میں ایسے اشارات موجود ہیں جو معروضی صورت میں موجود ہیں۔ اگر ان معروضی معانی کو تسلیم کر لیا جائے تو یقیناً کسی نہ کسی نوع کی ذہنی حیات کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اہل مذہب بھی کائنات میں معروضی قدروں کو مانتے ہیں اور ان کے حوالے سے خدا کے وجود کا اثبات کرتے ہیں۔ پھر جرمن فلاسفر ایوکن اور برطانوی سکالر جیمز وارڈ نے جرمن مثالیت کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک قدم اور آگے بڑھایا کہ ہیگل اور اس کے متبعین کے وجودِ متعلق یا روح کل کو مذہب کا خدا تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ کوئی ذی ارادہ اور قادرِ مطلق ہستی نہ تھی۔ مزید براں یہ وجودِ مطلق کائنات سے ماوراء نہیں بلکہ اس میں جاری وساری ہے۔ مگر اس فلسفہ سے مذہب کے شخصی خدا کی نفی ہوتی ہے کیونکہ اگر اسے کائنات میں جاری وساری تسلیم کیا جائے تو خدا کائنات کا خالق نہیں رہے گا نہ وہ اس میں تغیر وتبدل کرنے پر قدرت رکھے گا۔

مذہب کے خدا کے لیے دو شرائط کا ہونا لازمی ہے، ایک یہ کہ وہ ایک ذی ارادہ ہستی ہو اور دوسرا یہ کہ وہ کائنات سے ماوراء ہو۔

برطانوی فلاسفر "Latsa" اور "James Ward" نے اس دِقت کو یہ کہہ کر رفع کرنے کی کوشش کی کہ خدا کائنات میں جاری وساری بھی ہے اور اس سے ماوراء بھی ہے۔

خدا کو ماوراء کہہ کر وہ خدا کو خالق منوانا چاہتے ہیں اور اسے طاری وساری کہہ کر اسے اعمال کائنات اور انسان کے عمل ارتقاء میں شامل بھی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خدا کائنات سے ماوراء ہو کر اس میں جاری ساری نہیں رہ سکتا اس لیے کہ یہ امر محالاتِ قطعی میں سے ہے اور منطق کی رو سے اسے اجتماع المغائرین کہا

جاتا ہے۔ جرمن رومانی فلاسفہ اوران کے متبعین کے افکار وانظار سے اہل مذہب نے اپنے عقائد کی توثیق کا کام لیا ہے اور ایک نیا علم کلام مرتب کر دکھایا ہے یہودیوں میں بیوبر ہندوؤں میں آندروگھوش اور مسلمانوں میں اقبال ہمارے دور کے متکلمین ہیں۔





انسان جب اپنے شعوری عہد میں داخل ہوا تو اس نے اپنی زندگی میں ایک صریح خلا کو محسوس کیا جو اسے بے چین رکھتا۔اس کے اندر سوالات ابلتے رہے مگر کوئی جواب دینے والا نہ تھا۔انسان اپنے وجود کے اندر اور اس کے باہر کی دنیا پہ ذرا سا بھی غور کرے تو دو نہایت شدید جذبے اس کے اندر جنم لیتے ہیں۔ایک شکر اور احسان مندی کا جذبہ اور دوسرا اس کی کمزوری اور عجز۔انسان اپنی زندگی کے جس گوشے پہ بھی نظر ڈالتا ہے تو اس کو صاف دکھائی دیتا ہے کہ انسان کی ساری زندگی بلکہ اس کا ایک ایک لمحہ کسی کے احسان سے بوجھل ہے۔چنانچہ وہ اپنے اندر ابلتے جذبہ شکر کو محسوس تو کرتا مگر اس کو کوئی راہ دکھائی نہ دیتی کہ وہ اپنی بہترین عقیدتوں کو اپنے کسی محسن کی نظر کر سکے اور خالق کی یہ تلاش انسان کے لیے محض کوئی فلسفیانہ نوعیت کی کوئی چیز نہیں تھی بلکہ انسانی نفسیات سے اس کا گہرا تعلق ثابت ہو چکا ہے اور آج کا دانشور جانتا ہے کہ خالق کی تلاش کا یہ سوال محض ایک خارجی مسئلے کو حل کرنے کا سوال نہیں بلکہ یہ ہماری اندرونی طلب ہے اور ہمارا پورا وجود اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے۔انسان جب دیکھتا ہے کہ وہ کائنات میں ایک مستقل واقعہ کی حیثیت

سے موجود ہے حالانکہ اس میں انسان کی اپنی کوششوں کا کوئی عمل دخل نہیں ۔ وہ مزید غور کرتا ہے تو ایک اور احساس اس کا احاطہ کرتا ہے کہ وہ خود کو ایک بہترین جسم میں پاتا ہے جس سے بہتر جسم کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا حالانکہ اس جسم کو خود اس نے نہیں بنایا ۔ پھر اس کو ایسی عجیب وغریب ذہنی قوتوں سے نوازا گیا جو کسی دوسرے جاندار کو نہیں دی گئیں اور ان قوتوں کو حاصل کرنے کے لیے بھی اس نے کچھ نہیں کیا اور نہ ہی کچھ کر سکتا ہے ۔ چنانچہ اس کے ذہن میں ہر آن یہ سوال ابلتا رہتا ہے کہ وہ کون ہے جس نے یہ جسم و ذہن اس کو عطیہ کیے ہیں ۔ انسانی فطرت اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے بے چین رہتی کہ اس کا محسن اس کا خالق کہاں ہے جو احسان پہ احسان کیے جاتا ہے مگر سامنے نہیں آتا ۔ چنانچہ اپنے اسی احساسِ تشنگی کے سکون کے لیے انسان نے فرضی معبود تراشے اور ان کی پوجا کرنے لگا ۔ مگر خالق نے بھی اسے زیادہ دیر تنہا نہیں چھوڑا اور اپنی تعلیمات اپنے رسولوں کے ذریعے اس تک پہنچائیں تاکہ وہ سیدھی راہ اور حقیقی معبود کی پہچان سے آشنا ہو ۔

گزشتہ باب میں ہم نے دیکھا کہ سائنس میں انسان کو کچھ ترقی حاصل ہوئی تو اس نے تکبر کی راہ اپنائی اور خالق کے وجود سے ہی انکاری ہو گیا ۔ انھوں نے انسانی زندگی اور کائنات کی مادی تشریحات پیش کیں مگر ان کے نظریات میں جھول تھا جس کو علم اور سائنس کی ترقی نے دور کر دیا اور انسانیت کو دوبارہ خالق کے در پہ ڈال دیا ۔ دراصل انسان نے جدید علوم اور سائنسی فکر کی ترقی پر جانا کہ پوری کائنات اور اس کے مظاہر خود زبانِ حال سے بول رہے ہیں کہ وہ کسی قوتِ قاہرہ کے حکم کے پابند ہیں اور اسی کی مرضی ہے زمینوں پہ بھی اور آسمان پہ بھی ۔ علم سائنس کی وجہ سے انسان نے یہ جانا کہ احسانات کا وہ سلسلہ جس کو وہ اب تک جانتا تھا حتمی نہیں بلکہ یہ ایک طویل سلسلہ ہے جو بحر و بر اور زمین و آسمان اور کائنات کی تمام وسعتوں کو محیط ہے ۔

انسان نے دیکھا کہ وہ کائنات میں ذرا سا تصرف کرنے کے بھی قابل نہیں بلکہ خود سے ہی کسی کے احسان کی مانند زمین و آسمان کا نظام اس کے لیے سازگار ہے ۔ انسان کو نہ تو کائنات پہ کوئی اختیار ہے اور نہ ہی وہ اپنی ضرورتوں کو خود سے پورا کرنے کے قابل ہے ۔ انسان کی ہزاروں ضرورتیں خود بخود پوری ہو رہی ہیں مگر اس کو ان کا شعور تک نہیں ۔ پوری دنیا کے ہر خطے میں حیرت انگیز طور پر انسان کی ضروریات پوری کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ اس بات کی منتظر تھی کہ حضرت انسان آئے اور وہ اس کی خدمت پر لگ جائے ۔ کائنات میں انسان کے لیے اتنے ہمہ گیر اور بیشمار انتظامات کیے گئے ہیں کہ ان کی تفصیل بیان کرتے کرتے عمر بیت جائے ۔ خالق نے حضرت انسان کے لیے قدم قدم پر اتنا

خوش رنگ اہتمام کیا ہے کہ انسان غور کرے تو دھنگ رہ جائے۔ چنانچہ یہ عطیات جن سے ہر دم آدمی دوچار ہو رہا ہے اور جن کے بغیر اس زمین پر انسانی زندگی اور تمدن کا کوئی تصور تک ممکن نہیں تھا۔ اس کے باوجود انسان صدیوں اِک بے چینی کا شکار رہا ہے اور وہ جاننا چاہتا ہے کہ یہ سب رنگ و بو اور طرح طرح کے میوے اس کے لیے کس ذات نے مہیا کیے ہیں۔ ہر آن وہ خالق کی کسی نعمت سے دوچار ہوتا ہے اور ہر آن اِک جذبہ شکر اس کے اندر انگڑائی لے کر بیدار ہوتا۔ وہ اپنے محسن کو دیکھنا اور جاننا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ شکر کے امنڈتے سمندروں کو اس خالق کے قدموں میں ڈال دے جو اس کا محسن ہے جو اس سے محبت کرتا ہے مگر سامنے نہیں آتا۔

چنانچہ اپنے محسن کے احسانات کو ماننا اور اس کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دینا اور اسے اپنے بہترین جذبات کے لیے مختص کرنا انسانی فطرت کا شریف ترین جذبہ ہے اور ہر آدمی جو کائنات پر غور کرتا ہے اس کے اندر جذبہ شکر کا احساس شدت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا خالق انسان کے اس جذبہ شکر کا جواب نہیں دے گا؟

کیا انسان اس کائنات میں ایک یتیم بچے کی طرح ہے جس کے احساسات کچلے جاتے ہیں مگر اس کی پرواہ کرنے والا کوئی نہیں ہوتا؟

اور کیا کائنات میں کسی ایسی ہستی کا وجود پایا جاتا ہے جو انسان کے جذبات و احساسات کا جواب دے اور اس کو سکون کی وہ دولت عطا کرے جس کا وہ صدیوں سے متلاشی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ایسا سوچنا بھی کہ خالق اپنی مخلوق سے لاپرواہ ہے پرلے درجے کی نادانی اور بیوقوفی ہے کیونکہ خالق کی تلاش کے لیے دور جانے کی ضرورت ہی نہ تھی اس کے ڈیرے تو انسان کے دل میں موجود ہیں فقط اس کو پہچاننے کا ہنر آنا چاہیے۔ انسانی دل احساسات و جذبات کا ایسا مرکز ہے جس سے روشنی اور خیر کی لہریں نکلتی ہیں۔ یہیں سے جذبہ شکر جنم لیتا ہے اور یہیں سے اشکِ ندامت اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ حیرت تو ان سائنس دانوں اور ان کی پیروی کرنے والی مادہ پرست ذہنیت پر ہے کہ وہ اپنے نفس کی غلامی سے نکلنے کے لیے تیار نہیں۔ عام آدمی تو عقلی طور پہ اتنا بالغ ہی نہیں ہوتا کہ خیر اور شر میں درست طور پہ فرق کر سکے مگر جن لوگوں کو اللہ نے علم دیا ہے وہی انسانیت کو گمراہ کرنے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر خالق اعلیٰ پیمانے پر انسان کے لیے خطہ زمین کے حالات کو سازگار بنانے کا اہتمام نہ کرتا تو ممکن ہی نہ تھا کہ انسان جیسی ناتواں مخلوق اپنی بقا کو ممکن بنا سکتی۔ آج کی جدید سائنس نے ہم کو اس علم سے آگاہی بہم پہنچائی کہ

انسان انتہائی عاجز اور بے بس مخلوق ہے۔ ذرا اس خلا کا تصور کریں کہ جس میں ہماری یہ زمین سورج کے گرد چکر لگا رہی ہے زمین کی گولائی تقریباً پچیس ہزار میل ہے اور وہ ایک ناچتے ہوئے لٹو کی طرح اپنے محور پر مسلسل اس طرح گھوم رہی ہے کہ ہر چوبیس گھنٹے کے اندر اس کا چکر پورا ہو جاتا ہے۔ گویا اس کی رفتار ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے اور اسی کے ساتھ وہ سورج کے چاروں طرف اٹھارہ کروڑ ساٹھ لاکھ میل کے لمبے دائرے میں نہایت تیز رفتاری سے دوڑ رہی ہے۔ خلا کے اندر اس قدر تیز رفتار سے دوڑتی ہوئی زمین پر ہمارا وجود قائم رکھنے کے لیے خالق نے زمین کی رفتار کو ایک خاص اندازے کے مطابق رکھا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زمین کے اوپر انسان کی حالت ان سنگریزوں کی طرح ہو جائے جو کسی متحرک پہیہ پر رکھ دیئے گئے ہوں ۔صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مزید انتظام کے طور پہ خالق نے زمین کو کشش ثقل کی قوت سے نوازا ہے جو انسان کے جسم کو کھینچے ہوئے ہے پھر اوپر سے ہر جسم پر ہوا کا ایک زبردست دباؤ ہے جو انسان کو سطح زمین پر متوازن رکھنے میں مددگار ہوتا ہے۔ ہوا کے ذریعے جو دباؤ انسان پر پڑ رہا ہے وہ جسم کے ہر مربع انچ پر پندرہ پاؤنڈ تک معلوم کیا گیا ہے۔ یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً 280 من کا دباؤ۔ یہی وہ حیرت انگیز انتظامات ہیں جن کی بدولت انسان خلا میں مسلسل دوڑتی ہوئی اس زمین پر اپنا توازن قائم رکھنے میں کامیاب رہتا ہے۔ ذرا سورج کے وجود پر تو غور کیجیے سورج کی جسامت آٹھ لاکھ پینسٹھ ہزار میل ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہماری زمین سے دس لاکھ گنا بڑا ہے۔ یہ سورج آگ کا ایک دہکتا ہوا سمندر ہے جس کے قریب کوئی بھی چیز ٹھوس حالت میں نہیں رہ سکتی ۔ زمین اور سورج کے درمیان اس وقت تقریباً ساڑھے نو کروڑ میل کا فاصلہ ہے۔

اگر اس کی بجائے وہ چاند کی جگہ یعنی دو لاکھ چالیس ہزار میل کے فاصلے پر آ جائے تو زمین پگھل کر بخارات میں تبدیل ہو جائے۔ یہی سورج ہے جس سے زمین پر زندگی کے تمام مظاہر قائم ہیں اسی لیے خالق نے اس کو زمین سے اتنے مناسب فاصلے پر رکھا ہے کہ زمین پہ حیات قائم رہے اور اس کی ساری رونقیں برقرار رہیں۔ یاد رہے کہ سورج اگر ایک خاص فاصلے سے زیادہ زمین کے نزدیک آ جائے تو زمین کی ہر چیز جل اٹھے اور اگر وہ ایک خاص فاصلے تک زیادہ زمین سے دور چلا جائے تو زمین برف کی طرح جم جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم تو خدا سے جوڑنے والی چیز ہے مگر اہل مغرب جو آج علم کے دعویدار ہیں سب کچھ جاننے کے باوجود خالق کے وجود پر کوئی دلیل اس لیے قبول کرنے کو تیار نہیں کہ اس طرح ان کو اپنے اس اندازِ زیست سے دستبردار ہونا پڑے گا جس کی بنیاد ہی خالق سے انکار پر رکھی ہے۔ اور وہ کائنات کے بہت سے راز جاننے کے باوجود

وہ خالق کی طرف راغب ہونے سے انکاری ہیں کہ انھیں غلامی اگرچہ پسند ہے مگر اپنے نفس کی اپنے خالق کی نہیں؟؟؟

آیئے اب نظم کائنات پر ایک نظر اور ڈالتے ہیں جو خالق کے وجود پر دلیل کی روشنی سے ہمارے سینوں کو منور کرے گی۔انشاءاللہ !!!

کائنات کی وسعت اور اس کی قوت کشش پر نگاہ تفکر ڈالیں تو ہم جانیں گے کائنات ایک بے انتہا وسیع کارخانہ ہے اس کی وسعت کا اندازہ ماہرین فلکیات کے نزدیک یہ ہے کہ روشنی جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے اس کو بھی کائنات کے گرد اپنا ایک چکر پورا کرنے کے لیے کئی ارب سال درکار ہوں گے اور یہ نظام شمسی جس پر ہماری یہ زمین قائم ہے بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے مگر پوری کائنات کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔کائنات میں اس سے بڑے بڑے بے شمار ستارے اور سیارے لامحدود وسعتوں میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں سے کچھ اتنے بڑے ہیں کہ ہمارا یہ پورا نظام شمسی آرام سے ان کے اوپر رکھا جاسکتا ہے۔جو قوت کشش ان بے شمار دنیاؤں کو سنبھالے ہوئے ہے اس کی عظمت کا تصور اس بات سے کیجئے کہ سورج جس بے پناہ طاقت سے زمین کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور اس کو وسیع ترین فضاء میں گر کر برباد ہو جانے سے روکتا ہے یہ غیر مرئی طاقت اس قدر قوی ہے کہ اگر اس مقصد کے لیے اگر کسی مادی شے سے زمین کو باندھنا پڑتا تو جس طرح گھاس کی پتیاں زمین کو ڈھانپے ہوئے ہیں اسی طرح ہمارا یہ پورا کرہ ارض دھاتی تاروں سے ڈھک جاتا۔چنانچہ ثابت ہوا کہ ہماری زندگی بلکلیہ ایسی طاقتوں کے رحم وکرم پہ ہے جن پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔انسان کی زندگی کے لیے دنیا میں جو انتظامات ہیں اور جن کی موجودگی کے بغیر انسانی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا وہ اتنے بلند پیمانے پر ہو رہے ہیں اور ان کو وجود میں لانے کے لیے اتنی غیر معمولی قوت تصرف درکار ہے کہ انسان انھیں خود سے وجود میں لانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔اس لیے کہ موجودات کے لیے جو طریق عمل مقرر کیا گیا ہے انسان کے لیے اس کو مقرر کرنا تو دور کی بات ہے ان امور پہ انسانی غلبے کے متعلق سوچنا بھی فضول ہے۔آج کا انسان جانتا ہے کہ اگر اس کائنات کی غیر معمولی قوتیں اس کا ساتھ نہ دیں یا انسانی تمدن سے ہم آہنگی اور موافقت نہ کریں تو انسان اس زمین پر ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا بلکہ وہ برباد ہو کے رہ جائے۔ایک ترقی یافتہ تمدن کا تو تصور بھی دور کی بات ہے۔انسان نے خالق کے ساتھ اپنے تعلق کو استوار کرنے کے لیے اس کی کائنات کے مظاہر پر غور کیا تو اس نے جانا کہ کائنات کا خالق کے ساتھ تعلق اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ انسان سے اس کا تعلق محبت پہ مبنی ہے۔ظاہر ہے

جس نے ہمیں خلق کیا وہ ہم سے محبت بھی کرے گا اور وہی ہے جو ہمارے لیے خطہ ارض پر مسلسل موزوں ترین حالات کو باقی رکھے ہوئے ہے اور ان کو ہمیشہ ہمارے لیے ہموار کرتا رہتا ہے جو ہر آن ہماری پرورش کر رہا ہے۔اس کا ہمارے اوپر یہ لازمی حق ہے کہ انسان اپنے مقابلے میں اس کی برتر حیثیت کو تسلیم کرے اور جب انسان خالق کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کرلے گا تو اس کا رخ کامیابی اور فلاح کی طرف موڑ دیا جائے گا۔

قدیم زمانوں سے انسان جن اقدار سے واقف ہے ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین قدر یہ ہے کہ احسان کرنے والے کا احسان مانا جائے محسن خواہ اپنی طرف سے نہ دبائے مگر جو احسان مند ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود اپنے محسن کے سامنے دب کر رہے اور عزت دار وہی ہے جو اپنے محسن سے نظر نہ ملائے اور اس کی رضا کی فکر میں لگا رہے اور خالق کا اپنی اس مخلوق سے مطالبہ بھی صرف اتنا ہی ہے کہ وہ اس کی رضا کی فکر کرے اگر چہ اس میں بھی خالق کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس میں صرف مخلوق ہی کی بھلائی ہے۔

چنانچہ خدا کا خدا ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان اس کی خدائی اور قدرت کو تسلیم کرے اور اس کی مرضی کو ہی اپنی ترجیح اول قرار دے اور بندے کی طرف سے خدا کی اطاعت کے لیے اس کے سوا کسی اور دلیل کی ضرورت بھی نہیں۔

مگر بات یہاں ختم نہیں ہوتی جب خالق کے وجود پہ دلیل حاصل ہو جائے تو حق شناسی کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنی عاجزی اور خدا کے غلبے کو دل کی گہرائیوں میں اتار لے اور اپنی بندگی کا رخ اس کی طرف موڑ دے۔حقیقت یہ ہے کہ انسان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ ہے بھی نہیں۔ ہماری زندگی کے سارے مسائل خدا سے متعلق ہیں ہم کو جو کچھ بھی ملے گا اسی کی طرف سے ملے گا۔سب اہل علم جانتے ہیں کہ اس کے سوا اور کوئی دینے والا ہے بھی نہیں۔انسان کائنات میں اس قدر عاجز اور مجبور ہے کہ وہ اپنے خالق کی توجہ کے بغیر ایک لمحہ بھی زمین پر اپنا وجود برقرار رکھنے پر قادر نہیں۔ چنانچہ اس کے لیے دانش کی راہ یہی ہے کہ وہ خالق کے در پر اپنے سر کو جھکا دے اور تکبر کی راہ اختیار نہ کرے۔

خود اپنے خطے کی جغرافیائی حقیقتوں پہ اگر ہم غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ شمالی ہندوستان کی سرحد پر اگر ہمالیہ کا پچیس سو میل لمبا سلسلہ نہ ہوتا اور اگر ہمالیہ کی بلندیاں ہمارے مفادات کی محافظ نہ ہوتیں تو خلیج بنگال سے اٹھنے والی وہ ہوائیں جو ہمارے خطے پہ سال میں دو دفعہ بارشیں برساتی ہیں ہمالیہ کی غیر موجودگی میں وہ سیدھی روس کی طرف نکل جاتیں اور پورا پاکستان منگولیا کی طرح لق و دق صحرا میں بدل جاتا اور یہاں کے لوگ بارش کے ایک ایک قطرے کو ترستے رہتے۔اللہ پاک نے اپنی کتاب میں سچ ہی کہا ہے کہ اگر انسان میری

پہچان کے لیے نکلے تو میری آیات ہر قدم پہ اسے ایک نئی حیرت میں مبتلا کرتی رہیں گی۔آج کے جدید علوم قدم قدم پہ اللہ کی آیات کی نشاندہی میں مصروف عمل ہیں۔آیئے ایک بار پھر سے سورج کے وجود پہ غور کرتے ہیں۔آج کا انسان اپنے جدید علوم کی معرفت سے جانتا ہے کہ وہ ایک غیر معمولی کشش سے ہماری زمین کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور زمین ایک مرکز گریز قوت (Centrifugal Force) کے ذریعہ سے سورج کی طرف جانے سے خود کو روکتی ہے۔

اس طرح وہ سورج سے دور رہ کر فضاء میں اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے ذرا سوچیں کہ اگر کسی دن زمین کی یہ قوت اچانک ختم ہو جائے تو وہ چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف سفر شروع کر دے اور چند ہفتوں میں سورج کے اندر اس طرح جا گرے جیسے کسی بہت بڑے آلاؤ میں کسی درخت کا کوئی سوکھا پتہ جا گرتا ہے۔ظاہر ہے اہل سائنس کم از کم اس امر سے ضرور واقف ہیں کہ زمین کو یہ طاقت انھوں نے فراہم نہیں کی اور نہ ہی سائنس اس طاقت کی ابھی کوئی توجیہ کر سکی ہے۔چنانچہ جس طرح سورج اور زمین کی یہ کشش ایک دوسرے کی قوت کو زائل کر کے ٹھیک اس مقام پر سفر کر رہے ہیں جس پر خالق کی منشا ہے اسی طرح کائنات کا پورا نظام اسی خالق کی مرضی کے تابع ہے۔ستاروں سے لے کر سیاروں تک،سمندروں سے لے کر پہاڑوں تک،شجر سے لے کر حجر تک،زمین سے لے کر آسمانوں تک،مشرق سے لے کر مغرب تک،شمال سے لے کر جنوب تک،اوپر سے لے کر نیچے تک،شیر سے لے کر ہاتھی تک،چیونٹی سے لے کر شہباز تک کسی مخلوق کو بھی خالق کی مرضی کے خلاف جانے کی جرأت نہ ہوئی مگر افسوس کہ بد قسمتی کی یہ عادت حضرت انسان کے حصے میں آئی جو اشرف المخلوقات ہے۔ذرا سے اختیار نے جس کے ظرف کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

چنانچہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ انسان جلد باز بھی ہے ناشکرا بھی ہے اور جھگڑالو بھی ہے یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان اس حقیقی سکھ اور طمانیت سے بہت دور ہے جس کے لیے اس کو پیدا کیا گیا تھا۔جب اس کا ذہن خالق کے وجود پہ تشکیک کا شکار ہو گیا تو پھر اس کو اس بھری کائنات میں سکون جیسی دولت کون عطا کرتا۔انسانوں کے بہت سے گروہ آج اس خطہ زمین پہ ان عنوانوں کے تحت زندگی کر رہے ہیں جن میں خالق کے وجود کی کوئی گنجائش نہیں بنتی۔چنانچہ جب انسان نے خالق سے منہ موڑا تو خالق تو ازل سے بے پرواہ ہے۔اسے کیا پڑی ہے کہ وہ کسی قوم کو امتحان کی آزادی سے ٹوکے۔اگرچہ نبی کریم محمد ﷺ کی دعوت کے بعد اور قرآن کی موجودگی میں انسان کی گمراہی ایسی ہی ہے جیسے ذہنی ابتری کا شکار کوئی شخص آگ کے گڑھے میں جا گرے۔دنیا بھر کے مصلحین اور دانشور آج کے انسان کی روٹھی خوشیوں اور تشنہ آرزوؤں کی

تلاش پہ مکالے لکھ رہے ہیں۔ حل کھوج رہے ہیں۔ وہ اپنی کھوج کے آغاز میں ہی مذہب کو بوسیدہ رسموں رواج کا مجموعہ قرار دے کر ان اندھیری گلیوں کو نکل جاتے ہیں جہاں نئے سراب ان کی منزل کھوٹی کرنے کے لیے ان کے منتظر ہوتے ہیں۔ فرائیڈ نے جنس میں انسانی آزار کو کھوجا تو مارکس نے دولت کی مساوی تقسیم میں قدیم یونانی حکماء نے جمہوریت اور نظام حکومت میں انسان کے سکھ کو تلاشا تو آج کا مغربی مفکر آسائش آسودگی اور مادیت کی انتہاؤں میں انسان کے ازلی سکون کا متلاشی ہے۔ مگر افسوس کہ میں جانتا ہوں وہاں بھی منزل کی جگہ نئے سراب ان کا انتظار کر رہے ہیں۔

کائنات پہ نگاہ ڈالیں تو اس کی وسعتوں کے جس ادنیٰ سے علاقہ میں حضرت انسان رہائش پذیر ہے۔ سائنس کی زبان میں اسے نظام شمسی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے اس نظام شمسی کو اگر انسان کسی بلند اور دور دراز مقام سے دیکھے تو وہ جانے گا کہ ایک اتھاہ خلا ہے جس کے اندر ایک گھومتا ہوا آگ کا بہت بڑا گولہ ہے جس کو ہم سورج کہتے ہیں اور جو زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے اور جس سے اتنے بڑے بڑے شعلے نکل رہے ہیں کہ ان کی لپٹیں کئی لاکھ میل تک خلاؤں کا احاطہ کیے رہتی ہیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اسی سورج کے گرد بہت سے سیارے ہیں جو سورج کے چاروں طرف اربوں میل کے دائرے میں پروانوں کی طرح اس کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ ان دوڑتی ہوئی دنیاؤں میں ہماری زمین نسبتاً ایک چھوٹی سی دنیا ہے جس کی گولائی صرف پچیس ہزار میل ہے۔ اگرچہ ابھی انسان اپنے نظام شمسی کی کلی ماہیت سے بھی واقف نہیں ہے مگر اتنا وہ جان چکا ہے کہ نظم کائنات میں ہمارے نظام شمسی کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے اور کائنات میں اتنے بڑے بڑے سیارے موجود ہیں جن کے مقابلے میں ہمارا یہ نظام شمسی زمین کی فضا میں اڑنے والے کسی ادنیٰ پروانے سے بھی حقیر ہے۔ چنانچہ کائنات کی ان اتھاہ وسعتوں میں انسان اپنے وجود کی ناتوانی کے احساس سے دوچار ہے اور اس کی بے بسی اس کی نارسائی اس کو کسی طاقتور سہارے کی تلاش پہ اکساتی ہے۔ وہ بے اختیار چاہتا ہے کہ کوئی تو ہو جو اس اتھاہ کائنات کے اندھیرے میں روشنی بن کے اس کی راہنمائی کرے وہ ایک ایسی ہستی کی پناہ چاہتا ہے جو کائنات کی قوتوں سے بالاتر ہو اور جس کی پناہ میں آ جانے کے بعد اس کو اطمینان ہو کہ اب وہ محفوظ ہو گیا ہے دراصل معبود کی تلاش ایک فطری جذبہ ہے۔ جو آدمی کی محبت اور اعتماد کا محور بن سکے موجودہ زمانے میں بعض اہل دانش نے وطن قومیت اور ریاست کو انسان کی اس طلب کا جواب بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید تہذیب انسان سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی قوم اپنے وطن اور اپنی ریاست کو یہ مقام دو کہ وہ تمہاری عقیدتوں کا مرکز بن کے رہ جائے اور اسی وابستگی کو اپنا سہارا بناؤ۔ اگرچہ ان چیزوں کو معبود کے نام

سے پیش نہیں کیا جاتا مگر انسانی زندگی میں ان کو جو مقام دیا گیا ہے وہ تقریباً وہی ہے جو دراصل کسی معبود کا مقام ہونا چاہیے۔ مگر ان چیزوں کو معبود کی جگہ دینا ایسا ہی ہے جیسے کہ کسی کو رفیق زندگی کی ضرورت ہو مگر اس کی اس طلب کے جواب میں پتھر کی ایک سل اس کے ہاتھ میں تھما دی جائے۔ کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ انسان کے اندر خالق کی تلاش کا جو جذبہ ابھرتا ہے اس کے اسباب انسانی نفسیات میں بہت گہرائی تک پھیلے ہوئے ہیں اور وہ ایک ایسی ہستی کی تلاش میں ہے جو ساری کائنات پہ محیط ہو۔ چنانچہ انسان کی اس طلب کا جواب کسی جغرافیائی خط میں نہیں دیا جا سکتا۔ یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ ایک سماج کی تعمیر میں کچھ مدد دے سکتی ہیں مگر وہ انسان کے تلاش معبود کے جذبے کو تسکین فراہم نہیں کر سکتیں۔ اس کے لیے تو انسان کو ایک کائناتی وجود درکار ہے جو انسان کی محبتوں کا مرکز و محور بن جائے جس نے زمین و آسمان کو بنایا ہو۔ اپنے سہارے کے لیے انسان کو ایک ایسی طاقت کی تلاش ہے جو کائنات کے اوپر حکمران ہو۔ جب تک انسان ایک ایسے ہی خالق کے وجود کو نہیں پا لیتا اس کا اندرونی خلا بدستور باقی رہے گا اور دور دور تک کوئی دوسری چیز اس خلا کو پر کرنے والی نظر نہیں آتی۔ اس خلا کو پر کرنے کی وہ کوشش جس میں اہل مغرب مبتلا نظر آتے ہیں ایک سعی عبث ہے۔ ایک سراب ہے جس میں حقیقت کا پرتو تو دیکھا جا سکتا ہے مگر حقیقت سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ حیرت ہے کہ اللہ نے انسان کو عقل عطا کی مگر وہ سایوں کا تعاقب کر رہا ہے۔ اللہ ہم سب پہ اپنا رحم فرمائے کہ اس کے سوا کوئی جائے پناہ ہے ہی نہیں۔





انسان کو شرفِ عقل سے نوازا گیا، عقل خالق کو تلاش کرنے کے لیے عطا کی گئی تھی مگر انسان نے اسے اپنی خواہش پورا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اپنی تشنہ آرزوؤں کے لیے راستہ تلاش کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اُس نے اگرچہ کائنات کی ماہیت اور انسان اور کائنات کے مابین باہمی تعلق کو جاننے کی سعی بھی کی مگر اس کے باوجود وہ اس راز کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا کہ سر کائنات انسان کا مقام کیا ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اس بات کا اہتمام کیا کہ انسان کو زندگی کی مقصدیت کی طرف بلایا جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ کے پیامبر ایک تسلسل کے ساتھ اللہ کا پیغام لے کر اترتے رہے اور لوگوں کو زندگی کی مقصدیت سے آگاہ کرتے رہے۔ پیغام ایک ہی تھا اگرچہ زمانے مختلف تھے، قومیں مختلف تھیں۔ اور آج اکیسویں صدی میں بھی پیغام حق وہی ہے جس کی اطلاع اللہ کے پیامبر روز ازل سے دے رہے ہیں۔

یعنی قرآن کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ!

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللهِ الْاِسْلَام۔

''بے شک اللہ کے نزدیک مقبول ترین دین اسلام ہی ہے''۔



چنانچہ آج بھی انسانیت کو جاہلیت، ضلالت، شقاوت، حیرت، قلق واضطراب اور زندگی وافکار کی پراگندگی سے اسلام کے سوا کوئی نجات نہیں دلاسکتا۔ کیونکہ تاریخ میں بھی ہر دور میں جب انسان شرکی دلدل میں دھنسا کسی غیبی امداد کا منتظر تھا تب بھی ہمیشہ اسلام ہی نے اُس کا ہاتھ تھاما۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت براہیم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسلام ہی کے داعی تھے انھوں نے لوگوں کو جس خیر کی طرف بلایا اسے اسلام ہی کہا جائے گا۔ اور یہی اسلام آنحضرت محمد ﷺ کی آمد پہ مکمل ہوگیا۔

ارشادِ باریٰ تعالیٰ ہے!

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۔

القرآن الحکیم (سورۃ المائدہ 3/5)

ترجمہ؛

''آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کر دیا اور میں نے تم پر انعام کیا اور میں نے اسلام کو تمھارے لیے بطور دین کے پسند کر لیا''۔



قرآن حکیم کی اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ہدایت کا سلسلہ آنحضرت محمد ﷺ پر مکمل کر دیا گیا۔ چنانچہ ہدایت کا یہ تازہ ترین ایڈیشن ہی انسانیت کی نجات کا محور قرار دیا جائے گا اور یہ ایک منطقی اور عقلی بات ہے۔ اسلام فکر وعمل، سیاسیات، اقتصادیات واجتماعیات، فنون واخلاق اور جنسی علائق غرض زندگی کے ہر شعبے میں انسان کی صحیح صحیح رہنمائی کرتا ہے اور شر کے ہر ہر سنگ میل پر انسان کو اس سے دور رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔ مغرب کے انحراف نے جس طرح انسانیت کو برباد کیا اور انسانی زندگی کے تمام معاملات کو خلل اور انتشار کا موجب بنا دیا اس پہ نگاہ ڈالی جا چکی ہے اور شر کے بہت سے پڑاؤ زیر بحث آچکے ہیں یہاں ہم صرف خیر یعنی اسلام کا تذکرہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ وحی الٰہی کا نور کس طرح انسان کی زندگی میں دور دور تک اجالے بکھیر دیتا ہے اور انسانی زندگی کا ہر پہلو پرسکون روانی کا منظر پیش کرتا ہے۔ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں کو مستقیم بنیادوں پر استوار کرتا ہے جس سے پوری انسانیت استقامت اور اطمینان محسوس کرتی ہے اور

انسانی معاشروں کی کلیات و جزئیات سب اپنی اور مناسب جگہ پہ استوار ہوتی چلی جاتی ہیں۔ دوسری طرف متکبرین ہیں جو اللہ کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں اور کسی خالق کے وجود سے عاری ہیں۔ یہ دنیا جس میں ہم بستے ہیں اس میں کثیر تعداد اُن لوگوں کی ہے جو تکبر کے جرم میں مبتلا ہیں۔ یہود نصاریٰ اور ملحدین میں اگرچہ کچھ فکری تفاوت موجود ہے مگر عملی طور پر وہ ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں یعنی متکبرین کے قبیلہ سے۔ قرآن حکیم میں انسان کو کائنات میں عزت و تکریم کا جو مقام عطا فرمایا ہے اُس کے مقابل یہود و نصاریٰ اور ملحدین کا تکبر نہایت جاہلانہ امر ہے جس کی تکذیب قرآن مجید میں جا بجا کی گئی ہے اور انسانوں کے اس گروہ کو اُن کی اصل اوقات یاد دلانے کے لیے بہت سی آیات اتاری گئی ہیں جن سے یہاں استفادہ مقصود ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ○ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ ○ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الطارق 5-7/86)

ترجمہ:

”انسان اپنی حقیقت کو تو دیکھے کہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے؟ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے جو پشت اور سینہ کی ہڈیوں کے درمیان کھنچ کر آتا ہے“۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

سورہ طارق میں ارشاد ہوا کہ :

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ○ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ۔

القرآن الحکیم (سورۃ الطارق 77-78/36)

ترجمہ:

”کیا انسان یہ نہیں دیکھتا کہ ہم نے اُس کو ایک قطرہ آب سے بنایا ہے اور اب وہ کھلم کھلا ہمارا حریف بنتا ہے، ہمارے لیے مثالیں دیتا ہے اور اپنی اوقات کو بھول گیا ہے“۔



سورہ سجدہ میں فرمایا گیا کہ :

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ (7) ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاء مَّهِينٍ (8) ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ ۔۔

القرآن الحکیم (سورۃ السجدہ 32/7-9)

ترجمہ:

"انسان کی ابتدا مٹی سے کی، پھر مٹی کے نچوڑ سے جو ایک حقیر پانی ہے اس کی نسل چلائی پھر اس کی بناوٹ درست کی اور اُس میں اپنی روح پھونکی"۔



سورہ حج میں انسان کے تخلیقی مراحل پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرمایا جاتا ہے کہ:

فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلاً ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّى وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئاً ۔۔

القرآن الحکیم (سورۃ الحج 5/22)

ترجمہ؛

"ہم نے تم کو مٹی سے، پھر قطرہ آب سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر پوری اور ادھوری بنی ہوئی بوٹی سے پیدا کیا تاکہ تم کو اپنی قدرت دکھائیں۔ اور ہم جس نطفہ کو چاہتے ہیں ایک مدت مقررہ تک رحم مادر میں ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں، پھر تم کو بڑھا کر جوانی کو پہنچاتے ہیں۔ تم میں سے کوئی وفات پا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کو پہنچ جاتا ہے کہ سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے بعد پھر ناسمجھ ہو جائے"۔



سورہ الانفطار میں فرمایا کہ :

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ الانفطار 82/6-8)

ترجمہ:

''اے انسان کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم سے مغرور کردیا ہے؟ اس رب سے جس نے تجھے پیدا کیا، تیرے اعضاء درست کیے، تیرے قویٰ میں اعتدال پیدا کیا اور جس صورت میں چاہا تیرے عناصر کو ترتیب دی''۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

سورہ النحل میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ النحل 78/16)

ترجمہ:

''اور اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا، جب تم نکلے تو تم اس حال میں تھے کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ اس نے تم کو کان دیئے، آنکھیں دیں دل دیئے شاید کہ تم شکر کرو''۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

سورہ مریم میں فرمایا کہ :

أَفَرَأَيْتُم مَّا تُمْنُونَ ۝ أَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ ۝ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ۝ عَلَى

أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ٥ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَى فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ ٥ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ٥ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ٥ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ٥ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ٥ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ٥ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ٥ أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ٥ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ٥ أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ٥ أَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ٥ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ ٥ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ٥

القرآن الحکیم (سورۃ مریم 58-74/56)

ترجمہ:

’’کیا تم نے اُس نطفہ پر غور کیا ہے جسے تم عورتوں کے رحم میں ٹپکاتے ہو؟ اس سے بچہ تم پیدا کرتے ہو یا ہم اس کے پیدا کرنے والے ہیں؟ ہم نے ہی تمھارے درمیان موت کا اندازہ مقرر کیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمھاری جسمانی شکلیں بدل دیں اور ایک اور صورت میں تم کو بنا دیں جس کو تم نہیں جانتے، اور تم پہلی پیدائش کو تو جانتے ہی ہو پھر اس سے سبق حاصل کیوں نہیں کرتے؟ پھر کیا تم نے دیکھا کہ یہ کھیتی باڑی جو تم کرتے ہو اِس کو تم اگاتے ہو یا اِس کو اگانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو بھس بنا دیں اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم نقصان میں رہے بلکہ محروم رہ گئے۔ پھر کیا تم نے اس پانی کو دیکھا ہے، جسے تم پیتے ہو؟ اس کو تم نے بادلوں سے اتارا ہے یا اس کو اتارنے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو کھاری بنا دیں۔ پس کیوں تم شکر ادا نہیں کرتے؟ پھر تم نے اس آگ کو دیکھا ہے جسے تم سلگاتے ہو؟ جن درختوں سے یہ لکڑی لائی جاتی ہے اُن کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم نے؟ ہم نے اس کو ایک یاد دلانے والی چیز اور مسافروں کے لیے سامانِ زیست بنایا ہے۔ پس اے انسان اے اپنے خدائے بزرگ و برتر کی تسبیح کیا کرو‘‘۔



سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا کہ :

وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَن تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ
فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْإِنسَانُ
كَفُوراً ○ أَفَأَمِنتُمْ أَن يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ
يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِباً ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ وَكِيلاً ○
أَمْ أَمِنتُمْ أَن يُعِيدَكُمْ فِيهِ تَارَةً أُخْرَى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ
قَاصِفاً مِّنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُم بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوا
لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعاً ○

القرآن الحکیم (سورۃ سورۃ بنی اسرائیل 17/67-69)

ترجمہ:

’’جب کبھی سمندروں میں تم پر طوفان کی مصیبت آتی ہے تو تم اپنے سب معبودانِ باطل کو بھول جاتے ہو اور اس وقت تمھیں صرف اللہ رب العزت کی یاد آتی ہے۔ پھر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو تم پھر پرانی روش پر لوٹ آتے ہو۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔ کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ خدا تم کو زمین میں دھنسا دے یا تم پر ہوا کا طوفان بھیج دے اور تم کسی کو اپنا مددگار نہ پاؤ۔ کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ خدا تم کو دوبارہ اس سمندر میں لے جائے اور تم پر ہوا کا ایسا طوفان بھیج دے تو تمھیں نافرمانی کے بدلے میں غرقاب کر دے اور پھر تم ہمارا پیچھا کرنے والا کسی کو حمایتی نہ پاؤ گے‘‘۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

یہ محض کچھ آیات تھیں جو اس ضمن میں پیش کی گئیں جن میں انسان کو تکبر کے رویے سے باز رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ خدا کے انکار سے روکا ہے، خدا کی خدائی میں اکڑ اکڑ کر چلنے سے ٹوکا ہے، اِن آیات میں انسان کے غرور و تکبر کو محض جہالت اور بلا جواز قرار دیا گیا ہے اور اُس کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی گئی ہے کہ پانی کے محض ایک اچھلتے ہوئے گندے قطرے سے تمھارا آغاز کیا گیا ہے۔ اُس حقیر پانی کے قطرے کی رحم مادر میں پرورش کی جاتی ہے اور وہ گوشت کے لوتھڑے میں بدل جاتا ہے۔ خدا چاہے تو اس لوتھڑے میں جان

ڈالے چاہے تو یونہی وہ غیر مکمل حالت میں خارج ہو جائے۔ خدا اپنی قدرت سے اس لوتھڑے میں جان ڈالتا ہے، اس میں حواس پیدا کرتا ہے اور اسے اُن آلات اور اُن قوتوں سے مسلح کرتا ہے جن کی انسان کو دنیوی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو یاد کراتا ہے کہ جب تم دنیا میں آئے تو کس قدر بے بس تھے، تم اپنی کوئی حاجت پوری کرنے پر قادر نہ تھے۔ تو وہ خدا ہی تھا جس نے اپنی قدرت سے ایسا اہتمام کیا کہ محبت سے تیری پرورش کی جائے، تو بڑھتا رہا، جوان ہوا طاقتور اور قادر ہوا۔ اللہ نے تجھے نعمتوں سے نوازا مگر تو نے اُس کا شکر ادا نہ کیا۔ تو دولت کے پیچھے بھاگا پھر اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کا غلام رہا۔ تو نے ایک بار بھی نہ سوچا کہ تجھے کس لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تو نے شرک کیا۔ حالانکہ تیرا رب اگر چاہتا تو تجھ سے تیرے گناہوں کا بدلہ ایک لمحے میں لے لیتا وہ تجھے بدترین سزا دیتا مگر اُس کا حلم اور رحم ہی ہے جو تجھ کو تیرے گناہوں سمیت اپنی زمین پر چلتا رہنے دیا۔

اے غافل انسان سُن!

اگر اللہ چاہتا تو ہوا کو حکم دیتا وہ رُک جائے تب تو سانس کیسے لیتا، اگر اللہ چاہتا تجھے پانی نہ ملے تو وہ سمندروں دریاؤں اور بادلوں کو حکم دیتا کہ غائب ہو جاؤ اور اگلے روز جب تم سو کر اٹھتے تو تم جانتے کہ کہیں بھی پانی نہیں تب تم کیا کرتے؟ یہ روشنی، یہ ہوا، یہ انواع اقسام کے پھل، یہ غلہ، یہ رنگ رنگ کے سامانِ زیست آخر تم کو کس نے عطا کیے اللہ نے اور تم اللہ کے خلاف باتیں کرتے ہو اللہ کی حکومت اور اقتدار کو افسانہ قرار دیتے ہو۔ افسوس ہے تم پر کہ تم کو عقل عطا کی گئی اس کے باوجود تم اپنے خالق کی حکمت اور دانائی تک نہ پہنچ سکے اور اُس کی نعمتوں کا شکر کرنے کی بجائے اُسی کی زمین میں فساد پھیلانے لگے۔ اگر تم اللہ کی اس کائنات، اس کائنات کے شاندار نظم اور رنگ رنگ کے مظاہر پر ایک بھی نگاہ تدبر ڈالتے تو کبھی ان راہوں سے انحراف کی جرأت نہ کرتے۔ مگر انسان تو نے لوگوں سے برا سلوک کیا، لوگوں کا حق مارا، لوگوں کو اذیت دی، دھوکے دیئے، کفر کیا، شکر سے دور رہے، حتیٰ کہ اس کی مہلت عمر گزرتی رہی، پھر تیرے اعضاء میں کمزوری آنے لگی، پھر تو بوڑھا ہو گیا، پھر تو بستر سے لگ گیا مگر تو نے کبھی توبہ نہ کی اپنے خالق کے در پہ اپنے گناہوں اور غلطیوں کا اعتراف نہ کیا حتیٰ کہ قبر کی مٹی نے تجھے اپنے اندر سمو لیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تکبر سے روکا اور اُس کو اُس کے اصل مقام سے آگاہ کیا۔ اب اسی تصویر کا دوسرا رخ دکھایا جاتا ہے جس میں انسان کو بتایا گیا کہ یہ درخت، یہ پہاڑ، یہ سمندر، یہ بجلی، یہ بادل، یہ آگ اس لیے پیدا نہیں کی کہ تو اِن اشیا کے سامنے جھک جائے بلکہ یہ سب کچھ تو تمھاری خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، یہ سب تو تیرے غلام ہیں کائنات کی ساری رونق تیرے ہی

لیے ہے اور تو ہے کہ عقل سلیم کے باجود اپنے ہی غلاموں کے سامنے سر جھکانے لگا۔ حالانکہ اللہ نے تو تجھے بلند رتبوں سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں انسان کی جس تکریم اور رتبے کو بیان کیا ہے اس ضمن میں چند آیات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے تاکہ انسان شکر کی راہوں کی طرف مراجعت کر سکے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ :

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا O

القرآن الحکیم (سورۃ بنی اسرائیل 17/70)

ترجمہ:

"اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور اُن کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور اُن کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی اُن چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں اِن کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے"۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

سورہ نحل میں فرمایا گیا کہ :

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (6) وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَى بَلَدٍ لَمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَؤُوفٌ رَحِيمٌ (7) وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (8) وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ (9) هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ (10) يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (11) وَسَخَّرَ لَكُمُ
اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (12) وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِي
الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ
(13) وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا
وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ
وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (14) وَأَلْقَىٰ فِي
الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ
تَهْتَدُونَ (15) وَعَلَامَاتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ (16) أَفَمَن
يَخْلُقُ كَمَن لَّا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (17) وَإِن تَعُدُّوا
نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (18) وَاللَّهُ يَعْلَمُ
مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ النحل 16/19-5)

ترجمہ:

”اور ہم نے جانوروں کو پیدا کیا جن میں تمھارے لیے سردی سے حفاظت کا سامان ہے اور دیگر فائدے ہیں جن میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ اِن میں تمھارے لیے ایک شان و جمال ہے جب کہ تم صبح اُن کو لے کر جاتے ہو اور شام کو واپس لاتے ہو۔ وہ تمھارے بوجھ ڈھو کر اس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں تک تم بغیر شدید دقت کے نہیں پہنچ سکتے۔ تمھارا رب بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ گھوڑے اور خچر اور گدھے تمھاری سواری کے لیے ہیں اور سامانِ زیست ہیں۔ خدا اور بہت سی چیزوں کو پیدا کرتا ہے جن کا تم کو علم بھی نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، اس میں سے کچھ تمھارے پینے کے لیے ہے اور کچھ درختوں کی پرورش کے کام آتا ہے جن سے تم اپنے جانوروں کے لیے چارہ حاصل کرتے ہو۔ اسی پانی سے خدا تمھارے لیے کھیتی اور انگور اور طرح طرح کے پھل اُگاتا ہے۔ اِن چیزوں میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اسی نے

تمھارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند اور تارے مسخر کیے ہیں، یہ سب اسی خدا کے حکم سے مسخر ہیں اِن میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور بہت سی وہ مختلف الانوع چیزیں ہیں جو اللہ نے زمین میں تمھارے لیے پیدا کی ہیں، اِن میں سبق حاصل کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔اور وہ خدا ہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کیا کہ اس سے تم تازہ گوشت (مچھلی) نکال کر کھاؤ، اور زینت کا سامان (موتی وغیرہ) نکال کے پہنو۔ اور تو دیکھتا ہے کہ کشتیاں پانی کو چیرتی ہوئیں سمندر میں بہتی چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ سمندر کو اس لیے بھی مسخر کیا گیا کہ تم لوگ اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی تجارت کرو) شاید کہ تم شکر بجالاؤ۔ اس نے زمین میں پہاڑ لگا دیئے کہ زمین تم کو لے کر جھک نہ جائے اور دریا اور راستے بنا دیئے کہ تم منزل مقصود کی راہ پاؤ۔ اور بہت سی علامات بنائیں منجملہ اُن کے تارے بھی ہیں جن سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں اور کیا پیدا کرنے والا اُس کے برابر ہو سکتا ہے جو پیدا کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرو تو اُن کو بے حساب پاؤ گے۔ اللہ واقعی بڑی مغفرت والا اور بہت رحم کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ تمھارے پوشیدہ اور کھلے ہوئے تمام رازوں سے آگاہ ہے"۔



اوپر جو آیات تحریر کی گئی ہیں اُن میں انسانی سوچ کے دو پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے اور اُس کی رہنمائی فرمائی گئی ہے۔ اول یہ کہ انسان سر کائنات اپنے مقام کو سمجھے اور جانے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ وہ انتہائی حقیر ہے اُس کی خدائی کے مقابل وہ بہت حقیر ہے اس لیے اُس کو زیبا نہیں کو وہ اپنا ہاتھ خالق کے گریبان تک لے جائے اور تکبر کی راہ کو چل دے، پھر فرمایا کہ انسان اس قدر ہیچ بھی نہیں ہے کہ وہ درختوں، پتھروں، بادل، بجلی اور آگ اور لکڑی اور پتھر کے بتوں کو اپنا معبود بنالے اور اُن سے حاجت روائی کے لیے اُن کو پکارنا شروع کر دے۔ انسان کو بتایا گیا کہ اُس کا رتبہ اس سے بہت بلند ہے اور وہ زمین پر اللہ کا نائب ہے اُس کا خلیفہ ہے تمام کائنات کو اُس کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے تا کہ وہ اللہ کے احکامات کی پیروی میں کوئی دقت محسوس نہ کرے۔ چنانچہ اُس کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ اللہ کا نائب ہے اور اُس کو اللہ کی عظمت اور بزرگی کے گیت گانے ہیں تا کہ وہ خود کو حق نیابت کا اہل ثابت کر سکے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الأَرْضِ خَلِيفَةً
قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ
نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ
(30) وَعَلَّمَ آدَمَ الأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى
الْمَلاَئِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلاَءِ إِن كُنتُمْ
صَادِقِينَ (31) قَالُوا سُبْحَانَكَ لاَ عِلْمَ لَنَا إِلاَّ مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ
أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (32) قَالَ يَا آدَمُ أَنبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ
فَلَمَّا أَنبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ
السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ
تَكْتُمُونَ (33) وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلاَئِكَةِ اسْجُدُوا لآدَمَ
فَسَجَدُوا إِلاَّ إِبْلِيسَ أَبَى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ
الْكَافِرِينَ (34) وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ
الْجَنَّةَ وَكُلاَ مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا وَلاَ تَقْرَبَا هَـذِهِ
الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الْظَّالِمِينَ (35) فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ
عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ
لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ
O

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 2/30-35)

ترجمہ:

”اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انھوں نے کہا! اے ہمارے رب کیا تو اُس کو زمین میں اپنا نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلائے گا، اور خونریزیاں کرے گا؟ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں

جانتے، اور اُس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ پھر اُن کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا، اگر تم سچے ہو تو مجھے اِن چیزوں کے نام بتاؤ؟ انھوں نے کہا' پاک ہے تیری ذات ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو توں نے ہم کو سکھایا ہے، اور تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک ہے۔ خدا نے کہا! اے آدم اِن فرشتوں کو اِن چیزوں کے نام بتاؤ ۔پس جب آدم نے فرشتوں کو اُن چیزوں کے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا' میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمینوں کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں جو کچھ تم چھپاتے اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو مجھے اُن سب کا علم ہے۔ اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو اُن سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اُس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا اور ہم نے آدم سے کہا کہ اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ مگر اس درخت کے پاس بھی نہ پھٹکنا کہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ مگر شیطان نے اُن کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوشحالی میں تھے اُس سے اُن کو نکلوا دیا"۔



سورہ حجر میں فرمایا کہ :

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ (28) فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ (29) فَسَجَدَ الْمَلَآئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ (30) إِلاَّ إِبْلِيسَ أَبَى أَن يَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ (31) قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا لَكَ أَلاَّ تَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ (32) قَالَ لَمْ أَكُن لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ (33) قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ (34) وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الحجر 12/11)

ترجمہ:

''اور جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں کالے، سڑے ہوئے، سوکھے ہوئے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں، پھر جب میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اُس کو سجدہ کرنا۔ چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اُس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ خدا نے کہا! ابلیس تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوا تو اُس نے جواب دیا میں ایسا نہیں ہوں کہ اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے کالے سڑے ہوئے، سوکھے ہوئے گارے سے بنایا ہے، خدا نے کہا تو جنت سے نکل جا۔ راندۂ درگاہ ہو، یوم جزا تک تم پہ لعنت ہے''۔



اس مضمون کو قرآن حکیم میں مختلف جگہ اور مختلف طریقوں سے متعدد بار بیان کیا گیا ہے اِن تمام آیت پر مجموعی نگاہ دوڑانے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فلاح کے لیے کون سا راستہ مقرر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا اور اُس کو فرشتوں سے بڑھ کے علم دیا اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی۔ فرشتوں کو حکم دیا کہ میرے اس نائب کو سجدہ کرو فرشتوں نے آدم کو سجدہ کر لیا اس طرح ملوکیت انسانیت کے سامنے جھک گئی انسانیت کی فضیلت مسلّم ہو گئی۔ مگر ابلیس نے انکار کیا اور وہ جنوں میں سے تھا اس طرح شیطانی قوتوں نے انسان کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا اور شیطانی قوتیں انسان کے سامنے سینہ تانے کھڑی ہو گئیں۔ انسان حقیقت میں تو مٹی کا ایک حقیر پتلا تھا مگر خدا نے اُس میں جو اپنی روح پھونکی تھی اور اُس کو علم میں جو فضیلت بخشی تھی اس بنا پر وہ خلافت خداوندی کا اہل قرار پایا۔ جب کہ شیطان نے اُس کی عظمت کو تسلیم نہ کیا اور اس جرم میں اُس پر لعنت بھیج دی گئی۔ مگر اُس نے قیامت تک مہلت مانگ لی کہ وہ انسان کو بہکانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ شیطان نے انسان کو بہکایا، جنت سے نکلوایا۔ اُسی روز سے انسان اور شیطان کے مابین رزم گاہ سج گئی۔ اللہ رب العزت نے انسان سے کہہ دیا جس نے میرے احکامات مانے، میرے بھیجے ہوئے رسولوں کی پیروی کی میں اُسے دوبارہ جنت میں داخل کر دوں گا یہی اسلامی تصورِ فلاح ہے یہی الہامی تصورِ فلاح ہے اور جو شیطان کے دھوکے میں آ گیا اور اُس کی پیروی کرنے لگا تو اُس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور وہ ناکام ہے۔

چنانچہ کتاب مبین میں ارشاد ہوا کہ :

فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (38) وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَـٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ○

القرآن الحکیم (سورۃ البقرہ 2/38-39)

ترجمہ؛

”تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، ایسے لوگوں کے لیے کسی سزا کا خوف اور کسی نامرادی کا رنج نہیں ہے اور جنھوں نے نافرمانی کی اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں اُن کو ہمیشہ رہنا ہے“۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

سورہ الاحقاف میں ارشاد ہوتا ہے۔

أُولَـٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَن سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۔

لقرآن الحکیم (سورۃ الاحقاف 16/46)

ترجمہ؛

”یہ وہ ہیں جن کی خطاؤں کو معاف کر دیا جائے گا اُن کے عمل قبول کر لیے جائیں گے اور انھیں جنتوں میں داخل کر دیا جائے گا“۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

سورہ المائدہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنتُم بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّأُكَفِّرَنَّ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن

تَحۡتِهَا الۡأَنۡهَار۔

القرآن الحکیم (سورۃ المائدہ 12/5)

ترجمہ:

''البتہ اگر تم نماز قائم کرو، زکواۃ دو اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور اُن کی مدد کرو اور اللہ کا قرض اچھی طرح ادا کرو تو میں تمھارے گناہوں کو تم سے دور کر دوں گا اور تم کو ایسی جنت میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی''۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

سورہ نساء میں فرمایا گیا کہ :

إِن تَجۡتَنِبُواۡ كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنكُمۡ سَيِّئَاتِكُمۡ وَنُدۡخِلۡكُم مُّدۡخَلاً كَرِيماً۔

القرآن الحکیم (سورۃ النساء 31/5)

ترجمہ:

''تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے اگر تم اُن سے باز رہے اور بری باتوں سے بچتے رہے تو ہم تمھاری خطاؤں کو معاف کر دیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے''۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ :

فَمَن تَابَ مِن بَعۡدِ ظُلۡمِهِ وَأَصۡلَحَ فَإِنَّ اللّهَ يَتُوبُ عَلَيۡهِ إِنَّ اللّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (39) أَلَمۡ تَعۡلَمۡ أَنَّ اللّهَ لَهُ مُلۡكُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرۡضِ يُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَيَغۡفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَاللّهُ عَلَى كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيرٌ ○

القرآن الحکیم (سورۃ المائدہ 39-40/5)

ترجمہ:

''تو جس نے خود پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کر لی اور خود کو سدھار لیا تو بے شک اللہ اُس کی طرف متوجہ ہوگا اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے کیا تجھے معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ ہی کے پاس ہے اور وہ جس کو چاہے معاف کر دے جس کو چاہے سزا دے اس لیے کہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''۔



سورہ مریم میں فرمایا گیا کہ :

إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَأُوْلَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئاً ○

القرآن الحکیم (سورۃ مریم 60/19)

ترجمہ؛

''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے تو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور اُن پر ظلم نہ کیے جائے گا''۔



سورہ فرقان میں ارشاد ہوا کہ :

إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحاً فَأُوْلَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّهُ غَفُوراً رَّحِيماً○

القرآن الحکیم (سورۃ الفرقان 70/25)

ترجمہ؛

''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو یہ وہ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں میں بدل دے گا اور بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے''۔



سورہ نساء میں ہی مزید ارشاد ہوا کہ :

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوَءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُوْلَئِكَ يَتُوبُ اللّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّهُ عَلِيماً حَكِيماً (17) وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّى إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الآنَ وَلاَ الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ۔

القرآن الحکیم (سورۃ النساء 17-18/4)

ترجمہ:

’’اللہ اُن کی توبہ ضرور قبول کرتا ہے جو نادانی سے گناہ کر بیٹھتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کرتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں اللہ جن کو معاف کردے گا۔ اللہ سب جانتا ہے اور وہ بہت حکمت والا ہے، مگر اُن کی توبہ قبول نہیں کی جاتی جو برے کام کرتے ہیں اور کرتے ہی چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے کہا اب میں نے توبہ کی یہ تو اُن کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں گے‘‘۔



سورہ ہود میں فرمایا کہ :

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُواْ فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ (106) خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالأَرْضُ إِلاَّ مَا شَاء رَبُّكَ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ (107) وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُواْ فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالأَرْضُ إِلاَّ مَا شَاء رَبُّكَ عَطَاء غَيْرَ مَجْذُوذٍ۔

القرآن الحکیم (سورۃ ہود 106-108/11)

ترجمہ:

’’سارے بد بخت دوزخ کی خوارک بنیں گے اور انھیں اس میں گدھوں کی طرح رینگنا ہے

اور چلاتا ہے جب تک کہ آسمان اور زمین رہیں گے وہ اسی دوزخ میں رہیں گے مگر تیرا رب جو چاہے کرسکتا ہے اور جو خوش قسمت ہوں گے ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم رہیں مگر جو تیرا رب چاہے اللہ کی بخشش لامحدود ہے"۔



سورہ بینیہ میں فرمایا کہ :

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (6) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (7) جَزَاؤُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ (8)

القرآن الحکیم (سورۃ بینہ 6-8/89)

ترجمہ؛

"بے شک اہل کتاب اور مشرکوں میں سے جنھوں نے کفر کیا وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں جلتے رہیں گے اور یہ بدترین لوگ ہیں۔ بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ بہترین لوگ ہیں اور اُن کی جزا اُن کے رب کے نزدیک بسنے کے وہ باغ ہیں جن میں نہریں بہتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اُن کا رب اُن سے راضی ہو گیا اور وہ اپنے رب سے راضی ہو گئے"۔



سورہ تغابن میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

وَيُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (9) وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا

بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ○

القرآن الحکیم (سورۃ التغابن 9-10/64)

ترجمہ:

''اور اُس کو اُن باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے اور جنھوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلا دیا وہی دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے''۔



جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلامی تصورِ فلاح سیدھا اور سہل ہے۔ انسان کو بتا دیا گیا کہ وہ اللہ کی مخلوق ہے جس طرح کہ اللہ کی لاکھوں کروڑوں دیگر مخلوقات ہیں۔ انسان کو دیگر تمام مخلوقات سے ممتاز حیثیت سے نوازا گیا ہے۔ اُس کو علم و عقل سے نوازا گیا اور اُسے اختیار دیا گیا کہ وہ چاہے تو اللہ کی پیروی کرے اور اپنی دنیا اور آخرت دونوں سنوار لے چاہے تو اپنے نفس کی پیروی کرے اور شیطان کا مطیع و فرمانبردار بن کر اپنے نفس کا قیدی بن جائے۔ انسان نے اپنے اس اختیار کا اکثر و بیشتر غلط استعمال کیا اور نفس کی آواز پہ ہی کان لگائے اس لیے شیطان انسان کی راہ میں گھات لگائے بیٹھا ہے اور وہ اسے فوری اور سامنے کے منافع کا لالچ دے کر ورغلاتا ہے اور انسان دھوکے میں آ جاتا ہے۔ یاد رہے اکثر و بیشتر مذاہب میں موت کے بعد حیات کا تصور موجود ہے جزا اور سزا کا تصور بھی موجود ہے، یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں تک میں بعد موت از حیات کا تصور موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اِن مذاہب کے پیروکار نہ تو اپنے ادیان کے بارے میں سنجیدہ ہیں اور نہ ہی انھیں اس بات کی کوئی خاص پرواہ ہے کہ موت کے بعد اُن کے ساتھ کیا واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اسلام نے آخرت کے تصور کو نہایت واضح اور بین دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے اور انسان کے سامنے اس امر کو کھول دیا ہے کہ اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہی ہے۔ اس دنیا میں جیسے کیسے وقت گزرے مگر اللہ کی اطاعت کے ساتھ گزرے تو انسان کامیاب ہو گیا۔ دوسری صورت میں یہ زندگی چاہے اُس کے لیے کس قدر آسان ہو، اُس کے پاس دولت کے کتنے ہی انبار ہوں چاہے اُس کی جائیدادوں کو گنا نہ جا سکے اللہ کو اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہیں اللہ کے نزدیک اگر کوئی چیز وزن رکھتی ہے تو وہ صرف تقویٰ ہے۔

انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ یہ دنیا دارالعمل ہے، سعی اور کوشش کی جگہ ہے، احتیاط اور نرمی کی جگہ ہے، اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رہنے بسنے کے آداب شرح و بست کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں، رشتے داروں کے حقوق، پڑوسی کے حقوق، غریبوں مسکینوں کے حقوق، بے سہارا اور مجبوروں کے حقوق، والدین کے حقوق، اولاد کے حقوق، الغرض حقوق العباد کا ایک پورا نظام ہے جو وضع کر دیا گیا اور اللہ کے احکامات میں اِن کی بہت اہمیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو بتایا کہ یہ زندگی مختصر ہے، اِس کو اِس طرح گزارو کہ خود کو اللہ کی نافرمانی سے محفوظ رکھ سکو اور آخرت دارالجزا ہے نیکی اور بدی اچھے اور برے عمل کے پھل کی جگہ ہے۔ انسان کو موت کی گھڑی تک مہلت ہے جونہی سانس رکی مہلت عمل ختم ہوگئی اور انسان یا بدقسمتوں میں جا شامل ہوا یا خوش قسمتوں کا ساتھی بن گیا۔ بدقسمتوں میں اکثریت اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے اللہ کا انکار کیا۔ اُس کی رحمت سے منہ موڑا ہے، اپنی خطاؤں کی معافی نہیں مانگی۔

اپنی زندگی میں ایک نگاہ دوڑائیں، اپنے اردگرد دیکھیں، بازاروں گلیوں اور شاہراہوں پہ نگاہ کریں۔ اپنے گھر میں جھانکیں اور اس بات پہ غور کریں کہ ایک مسلمان کا گھر ہونے کے باوجود فکر آخرت کا معیار کیا ہے، حیَّ الفلاح حیَّ الفلاح کی آواز پر آپ کے بچے بستر چھوڑ دیتے ہیں، اللہ و اکبر کی آواز سے لوگ مسجد کی طرف جاتے ہیں یا ٹیلی ویژن دیکھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ صبح کو قرآن حکیم کی تلاوت کی جاتی ہے یا اُسے ریشمی غلاف میں لپیٹ کر بچوں کی پہنچ سے دور اوپر کی الماری میں رکھ دیا گیا ہے اور صرف رمضان کو ہی اتارا جاتا ہے۔ اپنے عقیدے کی اصلاح کے لیے قرآن و حدیث سے دلچسپی ہے یا سارا وقت دوکان یا دفتر کی نظر ہو جاتا ہے۔ آپ کے رشتے دار آپ سے راضی ہیں یا اُن کو آپ کی ذات سے گلہ ہے، آپ کے والدین آپ کو دعائیں دیتے ہیں، گزرتے وقت کا احساس، موت کی آتی چاپ اور روزِ محشر کی تیاری کے سلسلے میں تنہائی میں کبھی غور کیا ہے یا نہیں۔ یہ اور اس جیسے چند سوالات خود سے کرنے پر انسان جان جاتا ہے کہ وہ اُس عظیم الشان دن کو سرخسرو ہوگا یا شرمندہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے اور ہمیں روزِ محشر کی شرمندگی سے بچائے۔ یاد رہے کہ روزِ محشر کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے اور یہی اسلام کا تصور فلاح ہے۔

چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا کہ :

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ الانعام 6/162)

ترجمہ؛

’’کہو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میری زندگی اور میری موت سب خدا کے لیے ہے جو رب العالمین ہے‘‘۔



قرآن اور کائنات

انسان اور کائنات کے باہمی ربط کے بارے میں انسانی تاریخ میں اہل فلسفہ کی جدوجہد اور ان کے افکار و نظریات کے مطالعہ کے بعد اب قرآن کا کائناتی نظریہ پیش کیا جاتا ہے جس میں انسان اور کائنات کے باہمی ربط کو بھی اجاگر کیا گیا ہے اور انسان کا کائنات میں ایک مقام بھی متعین کیا گیا ہے۔ فلاسفہ اور اہل دانش کے نظریات تضادات سے پر ہیں اور فلاسفہ کے مختلف گروہ نظریاتی اور فکری طور پر منقسم نظر آتے ہیں۔ ان کے افکار میں قحطِ شعوری اور منطقی خلا موجود ہیں۔ ان کی آراء اور کائنات کے بارے میں بیشتر توجیحات سطحی ہیں اور فکری عادت سے ماوراء نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ عالم میں انسان کبھی بھی کسی ایک کائناتی نقطہ نظر کو اپنانے سے قاصر رہا ہے اور مختلف علاقوں کے لوگ اپنی توجیحات اور ترجیحات کے مطابق نظم کائنات کی تشریحات کرتے رہے ہیں اور انھی پہ ان کا اعتماد بھی رہا ہے۔ تاہم قرآن کا علم اپنی آفاقیت اور بے مثال نظم کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ کسی تضاد سے پاک ہے بلکہ اس ضمن میں قرآن کا نقطہ نظر عقلی اور منطقی حوالے سے بھی اتنا مکمل اور جامع نظر آتا ہے کہ کوئی بھی عدل پسند دل اس سے انکاری نہیں ہوسکتا۔ چونکہ قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے اور کائنات کے خالق کا انسان کو یہ آخری خطاب ہے اس لیے پورے یقین کے ساتھ یہ

بات کہی جاسکتی ہے کہ نظام کائنات اور انسان کے بارے میں قرآن کا نقطہ نظر ہی حتمی ہے جس میں اس دنیا کی منطقی انتہا تک کسی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اہل فلسفہ اور سائنس کے وسیع میدانوں کے راہی اگر قرآن کی راہنمائی میں اپنے نقطہ نظر کو متعین کریں گے تو جلد ہی منزل مقصود حاصل کر لیں گے۔ ورنہ پانچ ہزار سالہ فلسفہ کی تاریخ میں اہل دانش نے جو تیر مارے ہیں ان کا ذکر ابھی اوپر گذرا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر فلسفہ اور سائنس قرآن سے راہنمائی حاصل کئے بغیر مزید پانچ دس ہزار سال بھی تحقیق و جستجو میں گذار دیں تب بھی منزل ان کی نظروں سے اوجھل ہی رہے گی اس لیے بہتر اور خیر پہ مبنی انسانی رویہ یہی ہے کہ وہ الٰہیات کو فرسودہ رسم ورواج کا پلندہ قرار دینے کی بجائے اس بحرِ بے کراں میں اتر کے دیکھے تب وہ جانے گا کہ قرآن ہی وہ حرفِ آخر پیش کرتا ہے جس میں اس کے تمام مسائل کا حل پوشیدہ ہے۔ قرآن نے انسان کو زمین پہ خدا کا خلیفہ بتایا ہے اس نے نہایت وضاحت کے ساتھ تخلیق انسانی کا ماجرا بیان کیا ہے اور وہ تمام مناظر انسان کی آنکھوں کے سامنے روشن کیے ہیں جن کی کھوج میں انسان صدیوں فلسفے اور سائنس کے اندھے غاروں میں دھکے کھاتا پھرا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کیا کہ میں زمین پہ انسان کو اپنا خلیفہ مقرر کرنے لگا ہوں جس پہ فرشتوں نے جانا کہ اللہ اس نئی مخلوق کو اختیار اور آزادی دینے والا ہے۔ اس پہ انھوں نے اپنے کچھ تحفظات کا اظہار بھی کیا کہ اے اللہ انسان خلیفہ کی حیثیت سے زمین کو فتنہ وفساد سے بھر دے گا اور جہاں تک تیری تسبیح وتحمید کا تعلق ہے تو ہم نے اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے استدلال کو اہمیت نہ دی اور کہا تم وہ نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بتایا کہ چونکہ تم میری پوری اسکیم سے آگاہ نہیں ہو اس لیے تمہیں یہ اشتباہ ہوا ہے میں اگر انسان کو اختیار دوں گا تو اس کی ہدایت اور راہنمائی کا اہتمام بھی کروں گا اور اس پہ حجت تمام کروں گا اس کے بعد اگر وہ غلطی کرے گا تو اپنے اختیار سے کرے گا جس کی اسے سزا بھی بھگتنی ہوگی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ جب میں انسان کی نوک پلک سنوار لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کی تعظیم کرنا۔ اس پہ فرشتوں نے آمین کہا اور یوں اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اور اختیار کی آزادی کے ساتھ زمین پہ اپنا نائب نامزد کر دیا۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً

قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاء وَنَحْنُ
نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ
(30) وَعَلَّمَ آدَمَ الأَسْمَاء كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى
الْمَلاَئِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي بِأَسْمَاء هَؤُلاء إِن كُنتُمْ
صَادِقِينَ (31) قَالُوا سُبْحَانَكَ لاَ عِلْمَ لَنَا إِلاَّ مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ
أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (32) قَالَ يَا آدَمُ أَنبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ
فَلَمَّا أَنبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ
السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ
تَكْتُمُونَ (33) وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلاَئِكَةِ اسْجُدُوا لآدَمَ
فَسَجَدُوا إِلاَّ إِبْلِيسَ أَبَى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ
الْكَافِرِينَ (34) وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ
الْجَنَّةَ وَكُلاَ مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا وَلاَ تَقْرَبَا هَذِهِ
الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الْظَّالِمِينَ (35) فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ
عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ
لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ
O

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 2/35-30)

ترجمہ:

”اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انھوں نے کہا! اے ہمارے رب کیا تو اُس کو زمین میں اپنا نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلائے گا، اور خونریزیاں کرے گا؟ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور اُس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ پھر اُن کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا، اگر تم سچے ہو تو مجھے اِن چیزوں کے نام بتاؤ؟ انھوں نے کہا، پاک ہے تیری

ذات ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھایا ہے، اور تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک ہے۔ خدا نے کہا! اے آدم اِن فرشتوں کو اِن چیزوں کے نام بتاؤ ۔پس جب آدم نے فرشتوں کو اُن چیزوں کے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا' میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمینوں کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں جو کچھ تم چھپاتے اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو مجھے اُن سب کا علم ہے۔ اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو اُن سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اُس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا اور ہم نے آدم سے کہا کہ اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ مگر اس درخت کے پاس بھی نہ پھٹکنا کہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ مگر شیطان نے اُن کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوشحالی میں تھے اُس سے اُن کو نکلوا دیا''۔



سورہ حجر میں فرمایا کہ :

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَراً مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ (28) فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ (29) فَسَجَدَ الْمَلآئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ (30) إِلاَّ إِبْلِيسَ أَبَى أَن يَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ (31) قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا لَكَ أَلاَّ تَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ (32) قَالَ لَمْ أَكُن لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ (33) قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ (34) وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ ○

القرآن الحكيم (سورة الحجر 12/11)

ترجمہ:

''اور جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں کالے، سڑے ہوئے، سوکھے ہوئے

گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں، پھر جب میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اُس کو سجدہ کرنا۔ چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اُس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ خدا نے کہا! ابلیس تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوا تو اُس نے جواب دیا میں ایسا نہیں ہوں کہ اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے کالے سڑے ہوئے، سوکھے ہوئے گارے سے بنایا ہے، خدا نے کہا تو جنت سے نکل جا۔ راندۂ درگاہ ہو، یوم جزا تک تم پہ لعنت ہے"۔



میرے نزدیک اسی کو علم الانسان کہتے ہیں جس کی خبر اللہ نے قرآنِ حکیم میں تخلیق آدم کے واقعے میں بیان کی ہے۔ اس کے برعکس مغرب نے انسان کو جو علم الانسان دیا ہے وہ خرافات کا پلندہ نظر آتا ہے۔ مغربی اہل دانش کے علم کی بنیاد قیاس پہ رکھی ہے جس کو وہ کھنڈرات سے برآمد ہونے والی اشیاء زمین کی تہوں سے نکلنے والی کھوپڑیوں اور ٹوٹے پھوٹے برتنوں سے اخذ کرتا ہے۔ آج کے ماہرین عمرانیات اپنا سارا فلسفہ انھی قیاس آرائیوں سے مرتب کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق کا حال یہ ہے کہ قدیم ٹیلوں کی کھدائی سے برآمد ہونے والی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کا جوڑ بعض اوقات اس طریقے سے ملاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹڈے کی ٹانگ کے ساتھ ہاتھی کا سونڈ جوڑ دیا گیا ہے اپنی انھی تحقیقات کے نتیجے میں وہ اپنی مختلف النوع رائے قائم کرتے ہیں کہ انسان نے مذہب کا آغاز یوں کیا یا تہذیب وتمدن نے ایسے ترقی کی، انسان کی معاشرت اور معیشت نے اپنے ارتقائی مراحل یوں اور یوں طے کیے۔ قرآن نے انسان کو جو علم الانسان عطا کیا ہے اس کے بارے میں مستشرقین نے اپنے بغض کا اظہار کیا ہے اور اس پہ شک وارد کیا ہے کہ ہمیں کیا معلوم کہ اللہ نے کب اور کیسے انسان اور فرشتوں کے باہمی معاملات کو طے کیا۔

ہر چند کہ اس نوع کی اکثر معلومات خود ان کی اپنی کتابوں میں بھی موجود ہیں حقیقت یہ ہے کہ بات کو سمجھنے کے لیے مذہب اور فلسفے کے راستوں کے مابین بنیادی فرق کو جاننا بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ حقائق تک پہنچنے کے یہ دونوں راستے اپنی نوعی صورت کے لحاظ سے کافی فاصلے پر کھڑے ہیں۔ فلسفے کے راستے میں ہر قدم پہ عقل کی راہنمائی میں چلنا پڑتا ہے اور ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کے ثابت کرنی پڑتی ہے، اگر کوئی مقدمہ بھی ثابت ہونے سے رہ گیا تو ساری زنجیر ٹوٹ کے بکھر جاتی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس مذہب میں ہر

بات ایک خاص یقینی معیار کے مطابق بیان کی جاتی ہے جس میں کسی قسم کا جھول نہیں پایا جاتا جس کے پیچھے یہ تصور کارفرما ہوتا کہ چونکہ بات کہنے والا خود کائنات کا خالق ہے وہ آگے پیچھے اور ماضی حال سے پوری طرح واقف ہے چنانچہ صرف وہی ذات ہے جو انسان کی راہنمائی اصل حقائق تک کرنے کے قابل ہے اس لیے اس کی بات تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ بعض اوقات اللہ ہمیں اپنی ایسی باتیں بھی بتاتا ہے جن کے متعلق انسان عقلی دلائل تو آسانی سے بہم نہیں پہنچا سکتا تاہم اس کا دل اور ضمیر گواہی دیتے ہیں کہ اللہ ٹھیک کہتا ہے اس نوع کے اکثر واقعات میں کوئی چیز بھی خلافِ عقل نہیں ہوتی۔ بلکہ ذرا سے تفکر کی ضرورت ہوتی ہے تاہم انسان اکثر و بیشتر اس بات پہ مطمئن ہی رہتا ہے کہ قرآن کی بہت سی باتیں اس دنیا میں نہیں سمجھیں جا سکتیں ۔مثال کے طور پہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے تو انسان اس کو ماننے پر تو مجبور ہے مگر اس کی ذات کیا ہے وہ کس شکل کا ہے وہ کن چیزوں سے بنا ہے اور کس طریقے سے وہ کائنات کے تمام بھیدوں کو بیک وقت جانتا ہے یہ سب باتیں اس دنیا میں سمجھ نہیں آسکتیں۔ اسی طرح تخلیق آدم میں بھی اللہ تعالیٰ نے بعض ایسے حقائق بیان کئے ہیں جن کی عقلی توجیہ تو ممکن نہیں مگر اصولاً اس سے انکار کی بھی کوئی وجہ نہیں۔

ہم عقلاً اس بات کا انکار نہیں کر سکتے کہ واقعہ یوں ہی پیش آیا ہو کیونکہ یہ تفصیلات جاننے کا ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ موجود ہی نہیں اور اس بات کے شواہد بھی موجود ہیں کہ واقعہ اسی طرح پیش آیا ہو جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے۔غور کریں تو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ انسان میں جو قابلیت ہے جو ذہانت ہے، جو حوصلہ ہے جو کارنامے ہیں اور اس کائنات میں اس کا جو مقام اور مرتبہ ہے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی فلسفہ اس بات سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا کہ انسان ہی اس کائنات کا حقیقی وارث ہے اور وہی اللہ کا حقیقی نائب ہے۔ آخر انسان کے اندر یہ قوامیت کے حوصلے اور کائنات کی ہر چیز کو مسخر کر لینے کے ولولے ہر چیز کو ایک نظم خاص کے تحت لانے کے منصوبے آخر کس چیز کا نتیجہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس بات کا کہ انسان کو کائنات میں خاص مقام حاصل ہے اور یہ کہ انسان کو اس کا شعور بھی حاصل ہے اس لیے اگر انسان کو قرآن اللہ کا خلیفہ بتاتا ہے تو انسان کو اس پہ کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ انسان کو اللہ نے کائنات میں اپنا خلیفہ بنایا تو یقیناً اس خلافت کی کچھ خصوصیات اور تقاضے بھی ہوں گے جن سے واقفیت ہی انسان کو کائنات میں اس کے حقیقی مقام کا درست ادراک فراہم کر سکتی ہیں۔ اس ضمن میں جو سوال سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ جب خالق کائنات کی ذات ایسی عظیم اور ارفع خصائص سے مزین ہے جس میں وہ ہر جگہ حاضر ہے اس کو نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ جو حیی و قیوم ہے اور اس پوری کائنات کو چلانے میں اسے ذرا بھی دشواری کا سامنا نہیں ہے تو اس کو کیا

ضرورت پڑی ہے کہ وہ اپنی کسی مخلوق کو زمین پہ اپنا نائب مقرر کرے۔ ظاہر ہے کہ خلافت کے اس منصب کا ایک ہی طریق باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پہ بھیجنے سے قبل آزادی و اختیار کی جو خصوصیات عطا کیں اس کو دراصل انسان کا امتحان مقصود تھا کہ وہ دیکھے کہ انسان اس دنیا کا نظام کس طریقے سے چلاتا ہے وہ اپنی زندگی کو خدا کے تابع ہو کر گذارتا ہے اور خدا کی مرضی کو پہچانتا ہے یا خدا کا باغی بن کے سامنے آتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا کے خلیفہ ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو اختیار اور عمل کی آزادی حاصل ہو کیونکہ اس کو مجبورِ محض بنا کر اس پہ خلافت کی ذمہ داریاں نہیں ڈالی جا سکتیں تھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انسان کی یہ خصوصیت نمایاں کی ہے کہ اسے اختیار اور ارادہ کی پوری آزادی میسر ہے۔ یہی چیز ہے جس کو قرآن نے انسان کے بارِ امانت سے تعبیر کیا ہے قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ؛

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الاحزاب ۳۳-۷۲)

ترجمہ؛

''اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے مگر انسان نے اس کو اٹھالیا''۔



یعنی اللہ پاک دراصل یہ بتانا چاہتے ہیں کہ زمین و آسمان میں یہ صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ اس امانت کا بوجھ اٹھا سکتے اور اللہ کی کروڑوں مخلوقات میں سے اکیلا انسان ہی تھا جو اس بارِ امانت کا اہل تھا۔ چنانچہ یہ بارِ امانت اسی کے سپرد کیا گیا۔ یاد رہے کہ انسان کا اختیار بہر حال مطلق نہیں ہو سکتا بلکہ ایک محدود اختیار ہو گا کہ خلیفہ کے اختیارات آقا کی مرضی کے تابع ہی ہو سکتے ہیں اور انھی چیزوں میں ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں وہ آقا کے سامنے جواب دہ ہو۔ جن چیزوں میں انسان کے آقا نے اسے جواب دہ نہ سمجھا ہو اس معاملے میں اس کو اختیار دینے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ چنانچہ کسی انسان سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم فلاں خاندان میں کیوں پیدا ہوئے، تمہارا قد چھوٹا کیوں ہے، یا تم غریب کیوں ہو۔ البتہ انسان سے یہ ضرور پوچھا جائے گا کہ تم نے

نیکی کے بجائے بدی کی راہ کیوں اختیار کی، تم نے جھوٹ کے بجائے سچ کو ترجیح کیوں نہ دی کیونکہ یہ سب تو تیرے دائرہ اختیار میں تھا اور یہی انسان کا اصل امتحان ہے۔انسان کے اس اختیار کے متعلق یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اس کے استعمال میں انسان مکمل طور پہ آزاد نہیں ہے۔ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات کسی ایسے کام کا حکم دے جونیکی کا ہے مگر وہ اسے اپنی حکمت کے تحت اس سے روک دے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو کسی ایسے کام کی ڈھیل دے جو بدی کا ہو۔اگر خدا نے کسی مصلحت کے تحت کسی کو کسی نیکی سے روکا ہو تو اس کا اجر بہر حال محفوظ رہے گا گویا ثابت ہوا کہ مطلق اختیار صرف اللہ کو ہے انسان کا اختیار ایک خاص دائرے میں مقید ہے۔منصبِ خلافت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انسان کو کائنات کی تمام مخلوقات پر شرف بخشا گیا۔اسی لیے اس کو قرآن میں اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۝

القرآن الحکیم (سورۃ بنی اسرائیل ۱۷-۷۰)

ترجمہ:

”اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور خشکی اور تری میں دونوں میں اس کو سواری عطا کی اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پہ واضح فضیلت عطا کی“۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

چنانچہ خدا کے نائب اور خلیفہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے کائنات کے جس حصے میں خالق نے اپنا نائب مقرر کیا ہے اس میں وہ اشرف اور تمام دیگر مخلوقات سے افضل ہو۔اگر چہ انسان اپنی ظاہری حالت میں بھی بہر حال گھوڑوں گدھوں اور دوسرے جانوروں میں شامل نہیں ہے اور نہ ہی وہ ایک ترقی یافتہ بندر ہے۔وہ تمام اشیاء اور حیوانات پر واضح فضیلت رکھتا ہے اور اس کے خالق نے اس کو جو عزت بخشی ہے انسان کو اس کا بھرپور ادراک حاصل ہے۔اگر چہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہت سے لوگ جانوروں کی پوجا کرتے ہیں تو یہ محض ان کی عقل کا فتور ہے۔یہ لوگ احمق ہیں اور سفاہت میں مبتلا ہیں اس سے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی نفی نہیں ہوتی بلکہ انسان کے اس عمل سے صرف یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی عطا کی ہوئی

نعمتوں کا صحیح فائدہ نہیں اٹھایا۔اس لیے ہمارے نزدیک یہ تصور بھی قابل اعتناء نہیں کہ انسان حیوانات میں سے ایک حیوان ہے۔حیوان تو وہ ہے مگر حیوانِ ناطق ہے اور یہی چیز کائنات میں اس کا درجہ دوسری تمام مخلوقات سے بلند کردیتی ہے۔منصبِ خلافت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اللہ نے اپنے نائب کی راہنمائی کا قابل ذکر اہتمام کیا ہے۔اس نے انسان کو عقل فطرت اور وحی الٰہی کی سہ گانہ راہنمائی سے نوازا ہے اس لیے کہ انسان اپنی خلافت کے فرائض درست طور پہ اسی وقت ادا کرسکتا ہے جب اسے اپنے خدا کی مرضی کا پورا علم حاصل ہو۔چنانچہ اللہ نے انسان کے لیے علم کا اہتمام کیا،علماء نے اس کے تین درجے بیان کیے ہیں۔

یعنی وجدانی علم،عقلی علم اور شرعی علم،علم کا اصل ابتدائی اور ہمہ گیر ذریعہ وجدان ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ علم انسان کے اندر موجود ہے مگر وہ اسے بھولا ہوا ہے جو تجربہ مشاہدہ غور وفکر واقعات اور حوادث سے اسے یاد آتا رہتا ہے۔اسلوبِ سقراط میں علم کے اسی طریق کو ذریعہ بنایا گیا ہے کہ سوال و جواب کا تسلسل وجدانِ علم کو ابھارنے کا موجب بنتا ہے۔چونکہ سارا علمی خزانہ انسان کے بطون میں دفن ہے اس لیے انسان اپنی جہد وسعی سے اس کا سراغ لگا سکتا ہے۔یہ جو کچھ انسان کے علم وافکار ہیں یا سائنس ہے حقیقت میں یہ تمام تر انسان کی فطرت میں ہی پوشیدہ ہے۔ظاہر ہے کہ ریاضی کے سارے اصول اگر انسان کے اندر نہیں ہیں تو اس نے کہاں سے لیے ہیں کیونکہ علم کا نشان یا تو خالق کے ہاں ملتا ہے یا پھر اس کی مخلوق کے ہاں۔اب خالق کا علم تو خارج از بحث ہے اس لیے کہ وہ تمام علوم کا منبع ہے اور اس کی مخلوق میں علم صرف انسان کو عطا کیا گیا ہے۔اس لیے کہ باقی مخلوقات کو اس کی ضرورت ہی نہ تھی کیوں کہ ان کو ارادہ اور اختیار کی آزادہ ہی حاصل نہیں۔وہ فطرت کی طرف متعین کیے گئے مخصوص قوانین کے تحت ہی اپنی زندگیاں بسر کرتے ہیں اس لیے ضروری تھا کہ اللہ پاک اپنا علم اپنی اس مخلوق کو منتقل کرتا جس کا امتحان مقصود تھا۔وجدان کے بعد عقل ہے جو ہر وقت اور ہر معاملہ میں انسان کی راہنمائی کے لیے تیار رہتی ہے۔جزئیات سے کلیات بناتی ہے،زمین اور آسمان کے طول وعرض کو ناپتی ہے،سائنس اور فلسفہ کو ایجاد کرتی ہے اور اگر کسی معاملے میں اشتباہ پیدا ہو جائے تو عقل اپنے مختلف اصولوں پہ پرکھ کے بتاتی ہے کہ انسان کے وجدان نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔عقل اگرچہ بہت دور تک مار کرتی ہے مگر اس میں غلطی کے امکانات بہرحال موجود ہیں۔اس لیے کہ اس کی حدود بھی متعین ہیں اور وہ جب بھی اپنی حدود کو پھلانگے گی تو غلطی کرے گی۔اس لیے ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نائب کی اعلیٰ پیمانے پہ راہنمائی کا کوئی اور اہتمام بھی کرے۔چنانچہ اس ضمن میں خالق کا سب سے بڑا

احسان انسان پر یہ ہے کہ اس نے اپنے خلیفہ کی راہنمائی اپنے خاص علم سے کی جس کو علم وحی کہا جاتا ہے۔اللہ نے اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعے اپنے اس علم کو حضرت انسان پر اتارا تا کہ اسے فریضہ خلافت کی احسن ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں جو مشکلات حائل ہیں وہ دور ہو جائیں اور انسان اپنے لیے زندگی گذارنے کا وہ طریق اختیار کرے جو خالق کی مرضی سے مطابقت رکھتا ہو۔چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اصل حقائق سے خود آگاہ فرماتا ہے ان کو اپنے احکام وقوانین فراہم کرتا ہے تا کہ وہ زمین کا انتظام اس کی ہدایات کی روشنی میں کرے۔انبیاء علیہ السلام صدیوں اللہ کے اس خاص علم کو انسان تک منتقل کرنے کا فریضہ ادا کرتے رہے ہیں۔اس ذریعہ علم میں جو خاص بات اس علم کو دوسرے ذرائع علم سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس ذریعہ علم میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔چنانچہ انسانی علوم کے تمام اجزاء میں کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر کہیں ناموافقت در آئے گی تو ترجیح کے لیے پیمانہ درکار ہوگا یعنی علم وحی کو دوسرے ذرائع علم پر جو فوقیت حاصل ہے اس کا تقاضا ہے کہ اختلافی صورت میں علم وحی ہی کو حرفِ آخر تصور کیا جائے۔کیونکہ اسی طریق علم کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے اس لیے بھی کہ آخری اور ہر لحاظ سے تسلی بخش اور محفوظ علم کے طور پہ صرف قرآن ہی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔قرآن مجید ان تینوں ذرائع علم کے خزائن پیش کرتا ہے اور حق کو باطل سے جدا کرتا ہے۔صحیح اور غلط کی نشاندہی کرتا ہے معروف اور منکر میں امتیاز کے ضابطے بیان کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کی راہنمائی کے لیے جو اہتمام کیا ہے اسی کی بدولت اللہ نے فرشتوں کو کہا تھا کہ تم وہ نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں کیونکہ جب میں اپنے بندوں کی راہنمائی کروں گا تو وہ میری ہدایات کی پیروی کرے گا اسی لیے جب حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجا گیا تو ساتھ یہ پیغام بھی دے دیا کہ:

فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ البقرہ ۲ ۔ ۳۸)

ترجمہ:

''تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔



یعنی وہ لوگ جو اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت زندگی بسر کریں گے وہ شیطان کے فتنوں سے محفوظ

رہیں گے اور وہ ان کو گمراہ کرنے کے لیے جتنے بھی وسوسے پیدا کرے گا یا جتنے بھی فتنے اٹھائے گا اللہ اس کو محفوظ رکھے گا۔ اسی تناظر میں اللہ نے انسان اور کائنات کے باہمی ربط کو بھی ظاہر کر دیا ہے۔ قرآن نے انسان کو بتایا کہ تمام کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے یعنی کائنات کے سب مظاہر انسان کی خدمت پر معمور ہیں اور یہ سورج، چاند، ستارے، حیوانات، نباتات اور جمادات سب کو انسان کی فلاح اور آسانی فراہم کرنے کا فرض سونپا گیا ہے۔

اس کی وجہ یہی ہے انسان چونکہ زمین پہ اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے تو اسے کائنات کی اشیاء پر کسی درجے میں تصرف کا اختیار ہونا چاہیے اور کائنات کی یہ ساری سازگاری اس لیے ہے کہ انسان اس کی تسخیر کی طرف مائل ہو اور اپنے خالق کا حقیقی ادراک حاصل کر سکے۔ میرے نزدیک انسانوں کا کوہ ہمالیہ کی چوٹیوں کو سر کرنا کسی جنون کی وجہ نہیں بلکہ یہ بھی منصبِ خلافت ہی کا اقتضاء ہے کہ انسان جب پوری کائنات میں اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے تو اس کا گوشہ گوشہ ٹٹولنا اس کی بلندیوں کو سر کرنا، اس کے نشیب و فراز کو جانچنا، سمندروں کی تہوں میں اترنا اور ہر چیز کی ماہیت، کیفیت اور افادیت کو معلوم کرنا بھی تو منصبِ خلافت ہی کی ذمہ داری ہے کیونکہ اگر انسان زمین کی پہنائیوں میں پوشیدہ خزائن تک نہ پہنچتا تو آج جو مادی اور معاشی ترقی نظر آتی ہے اس کا کوئی وجود نہ ہوتا۔ چنانچہ انسان کا پست حوصلہ اور گوشہ نشین ہونا اور ایک عضو معطل بن کے رہ جانے کو کسی بھی مذہب اور اخلاقی معیار نے پسند نہیں کیا اور اگر انسان راہبانیت اختیار کر لے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ کسی مانع سبب سے شعورِ خلافت سے عاری ہو گیا ورنہ انسان کے حوصلے اور اس کی قوامیت اس کی خلافت کا لازمی تقاضا ہیں۔ تاہم یہ بات ذہن میں رہے کہ بعض فلسفیوں کا یہ خیال درست نہیں کہ یہ کائنات انسان کے ہاتھ میں مسخر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اسے انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور اسے مسخر کر کے انسان کی خدمت پہ لگایا ہے۔ اس لیے انسان کا کائنات میں تصرف بھی متعین حدود میں رہا ہوگا۔ چنانچہ جب اللہ نے انسان کو منصب خلافت بخش دیا تو اس کے کچھ لازمی تقاضے بھی ہیں جن پہ عمل کر کے انسان اپنے فرائض کو احسن طریقے سے ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ منصبِ خلافت کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے لیے ایک دائرہ عمل فراہم کرے اور اسی دائرہ عمل میں انسان کا امتحان مقصود ہے اس لیے نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

كلكم راع و كلكم مسئول عن رعيته

(صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب ۵)

ترجمہ؛

یعنی تم میں سے ہر ایک کو کوئی نہ کوئی ذمہ داری سونپی گئی اور وہ اپنی ذمہ داری کے بارے میں اللہ کے آگے جواب دہ ہے۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

انسان چونکہ اللہ کا خلیفہ ہے اس لیے وہ شتر بے مہار نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی باگ ہمیشہ کے لیے آزاد نہیں چھوڑی جائے گی بلکہ ایک دن وہ اپنے خالق کے سامنے جوابدہی کے لیے پیش ہو گا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ قیامت کا واقع ہونا لازم ہے کہ اگر انسان نے اپنی خلافت کی ذمہ داریاں احسن طریقے سے پوری کی ہیں تو اس کو انعام سے نوازا جا سکے۔ دوسری صورت میں اس کو سزا دی جا سکے۔ چنانچہ خلیفہ ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان مدنیت اور اجتماعیت کا شعور بھی حاصل کرے کیونکہ اس نے ایک ایسا سماج وضع کرنا ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے اس لیے انسان کو مدنیت اور سیاسیات کے میدان میں بھی جدوجہد کرنی چاہیے کیونکہ مدنیت اور سیاست کوئی مصنوعی چیزیں نہیں ہیں جن سے گریز کیا جائے بلکہ یہ زندگی کی حقیقتیں ہیں اور فطری حقیقتیں ہیں۔

اس لیے کہ خلافت کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ انسان کو اس کائنات میں ایک خاص دائرے میں اختیار ملے گا جس کو استعمال کر کے اس نے دنیا کا نظم و نسق چلانا ہو گا اور تمام امر و نہی اسی کے اختیار میں ہو گا تو یہ تمام چیزیں سیاسی اقتدار اور سیاسی اداروں کو مستلزم ہیں، چنانچہ خلافت کے سیاسی نظام کے متعلق بھی چند باتیں بنیادی شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں کہ اس میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کو حاصل ہو گی اور اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا منصبِ خلافت پہ فائز ہونا اس کا ذاتی عمل نہیں ہے بلکہ زمین پہ اس کو جو اختیار حاصل ہے وہ اللہ ہی کا تفویض کردہ ہے یعنی انسان کو خود سے کوئی اختیار حاصل نہیں بلکہ اس کو تفویض (Delegated Powers) کیا گیا ہے اور خود خلافت کے معنی ہی میں یہ بات شامل ہے کہ اس میں ایک بالاتر ہستی کی نیابت کی جائے گی۔ لہٰذا آپ اللہ کی حاکمیت کے تحت اس کی مقررہ حدود (Four

(Corners) کے اندر اپنے اختیار استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔ انسان ان حدود کے باہر نہیں جا سکتا کیونکہ اگر انسان ان حدود کو نظر انداز کرے گا تو اسے باغی کہا جائے گا اور یہی نقطہ نظر زمین پہ فساد کا باعث ہے۔ اس لحاظ سے ان حدود کے اندر جو ضابطے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیئے ہیں انھی میں رہتے ہوئے انسان اپنے اختیارات کو استعمال کرے گا۔ اسے جو اختیار (Mandate) ملا اسی کے مطابق اسے کام کرنا ہوگا وہ اس سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ چنانچہ خلافت کا منصب تمام بنی آدم کو حاصل ہے اس لیے اس استحقاق میں تمام بنی آدم مساوی درجہ رکھتے ہیں اور اس درجے کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرے میں سب انسان برابر ہوں اور کسی ذات یا خاندان یا خاص علاقے کے لوگوں کو کسی خاص علاقے کے لوگوں پر کوئی ترجیح حاصل نہ ہوگی۔ ان میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ صلاحیتوں کی بنیاد پر ہوگا دوسرے لفظوں میں عقائد صفات اعمال کردار کی بنا پر فرق کرنا ہوگا نا کہ ذات پات، حسب نسب، خاندان وطن زبان ثقافت کو فارق جانا جائے گا۔ اس لیے ان بنیادوں پر جو ریاست بنے گی وہ نسلی یا قومی ریاست نہیں ہوگی بلکہ اپنے مزاج کے لحاظ سے وہ ایک جہانی ریاست ہوگی جس کو وطن پہاڑ دریا اور سمندر تقسیم نہیں کر سکیں گے اور اگر اس جہانی ریاست کے قیام میں کچھ رکاوٹیں ہیں تو ان کو غیر فطری رکاوٹیں قرار دیا جائے گا اور ان رکاوٹوں اور مزاحمتوں کے خلاف جدوجہد کرنا ہوگی۔

چنانچہ خلافت ارضی کے حق دار بلقوۃ تو تمام انسان ہیں مگر اس کے اصل حق دار وہ لوگ ہیں جو اس زمین کا نظم و نسق خدا کے احکامات کے مطابق چلائیں گے اس لیے کہ جو لوگ خدا کی منشا کے خلاف چلیں گے تو وہ اس زمین کے باغی اور مفسد کہلائیں گے۔ قرآن میں اللہ نے اس امر کو کھول کے بیان کر دیا ہے۔ انسان اور کائنات میں باہمی ربط بھی بیان کر دیا ہے مگر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں بھی اس تصور کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ نے دو غلاموں کی تمثیل کے ذریعہ یہی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ باغ ان غلاموں کے سپرد نہیں کیا جاتا جو اس کو اجاڑ دیں بلکہ یہ انھی غلاموں کے سپرد ہونا چاہیے جو اس کو آراستہ و پیراستہ کریں اس لیے اس تمثیل کا مفہوم یہی ہے کہ باغ کی نگرانی کے حق دار بلقوہ تو سب لوگ ہیں لیکن بلا استحقاق صرف وہی لوگ ہوں گے جو باغ میں مالک کی منشا کو پورا کریں گے اور خلافت انھی لوگوں کا حق ہوگی جو زمین میں خدا کی منشا پوری کریں مگر افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ آج کا مسلمان اپنے منصب سے لاپرواہی کا مرتکب ہو رہا ہے یہی وجہ ہے کہ خلافت اس کے ہاتھ سے نکل گئی اور جب تک وہ زمین میں خالق کی منشا پوری کرنے کا علم

نہیں اٹھاتا اس وقت تک امت کی زبوں حالی ختم نہیں ہو سکتی اللہ ہم پہ اپنا رحم فرمائے۔





انسان جب شعور کی آنکھ کھولتا ہے تو اُس کے سامنے کئی منزلیں کئی اہداف نمودار ہوتے ہیں۔اگر وہ فکری انحراف کا شکار ہوگا اپنے خالق سے بے نیاز ہوگا، بغیر کسی الہامی رہنمائی کے اپنے اہداف کو مقرر کرے گا تو یقیناً اُس کا اٹھنے والا ہر قدم اُسے منزل سے دور ہی لے جائے گا۔چاہے وہ کچھ ظاہری اہداف کو حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جائے تب بھی وہ منزل سے کوسوں دور ہوگا اس لیے کہ خالق کی رضا تو اس میں تھی کہ انسان اُس جنت کی کھوج میں لگ جائے جہاں سے اُسے شیطان نے نکلوا دیا تھا۔وہ اپنے خالق کی رضا کو پالے اُس کی منشا کو جان لے اور اپنی زندگی کو خالق کی اطاعت اور رضا کے حصول میں گزارے تب وہ اُن دنیاوی اہداف کو بھی حاصل کرلے گا جن کا تخیل اُس کے ذہن میں موجود ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی کامیابی اُس کا مقدر بنے گی کہ حقیقی کامیابی تو صرف آخرت کی کامیابی ہے۔رسول اللہ ﷺ جب اس دنیا میں تشریف لائے فریضہ رسالت کو تندہی سے سرانجام دیا تو اس کے نتیجے میں ایک مختصر عرصے میں آپ ﷺ نے انسانی فکر

کی تطہیر فرما دی اُس کو راہ مستقیم پہ استوار کر دیا چنانچہ فکری اور عقائدی طور پہ درست اور پختہ یقین کے حامل یہ لوگ جب اللہ کا پیغام دنیا تک منتقل کرنے کے لیے سرزمین عرب سے باہر نکلے تو بڑی بڑی عظیم الشان ریاستوں نے اُن کے سامنے اپنے سر کو جھکا دیا۔ دنیا کی کوئی رکاوٹ فوجوں کی مہیب تعداد، عقیدہ و فکر کا اختلاف غرض کوئی بھی دنیاوی رکاوٹ حق کے اس سیل عظیم کا راستہ نہ روک سکی اور لوگ دور دور تک اللہ کے پیغام سے آگاہ ہو گئے اور اس پیغام کی دلکشی اُن کے دلوں میں اتر گئی۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے بارے میں کلام مقدس میں ارشاد فرمایا گیا:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ۔

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران 110/3)

ترجمہ؛

تم لوگوں کی اچھی جماعت ہو جس کو لوگوں کے بیچ اٹھایا گیا کہ تم لوگوں کو نیکی کی طرف بلاتے ہو اور برائی سے اُن کو منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔



چنانچہ ایک ہزار سال تک دنیا کی بیشتر آبادیوں پر حاملین قرآن ہی کا سکہ چلتا تھا۔ وہی لوگوں کے لیے حق اور باطل نیکی اور بدی کا معیار بن کے رہ گئے تھے۔ اگرچہ تب وہ بہت سی عملی اور اعتقادی گمراہیوں کا شکار بھی ہو چکے تھے مگر اُن کی بنیادی فکر اُن کی رہنمائی کے لیے ہمیشہ موجود رہی۔ چنانچہ ابتلا اور انارکی کے کسی بھی دور میں مسلمان فکری انتشار کا لقمہ نہیں بنے اور نہ ہی انھوں نے توحید کا دامن چھوڑا جس کی وجہ سے بہت سی کمزوریوں کے باوجود بھی لوگوں کی قیادت اور سیادت انھی کے ہاتھ میں رہی۔ مسلمانوں کے معاشروں میں اگرچہ شر کا وجود ایک زندہ حقیقت کی طرح ہمیشہ موجود رہا ہے مگر مسلمانوں کی فکری برتری اور کتاب مقدس کی موجودگی کی وجہ سے شر کو ابھرنے کا موقع نہیں ملتا اور وہ اپنی موجودگی کے باوجود معاشرے میں اُس فکری اور عملی فساد کو جنم نہیں لینے دیتا جس طرح کہ اہل مغرب کے ہاں ہوا کہ اُن کے فکری انحراف نے اُن کے سماجی اور عقائدی ڈھانچے کی دھجیاں بکھیر کے رکھ دیں اور وہ جاہلیت کی اُس وادی میں جا اترے جہاں اُن کا کوئی

پرسان حال نہ تھا۔چنانچہ فکری تصحیح کے لیے آج بھی وہی نسخہ کیمیا کامیاب ہے جس نے پندرہ سو سال پہلے انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ ادا کیا اور اُن کی فکر کو راہ مستقیم پہ ڈال دیا۔آج مسلمان معاشرے بظاہر کئی پہلوؤں سے مغلوب نظر آتے ہیں تاہم، اخلاق، عمل، عقائد اور فکری محاذوں پر آج بھی اُن کی برتری قائم ہے اور وہ اہل مغرب کی نام نہاد مہذب تہذیب کے لیے کھلا چیلنج بنے ہوئے ہیں۔چنانچہ اسلام اس حقیقت کو کھول کر بیان کر دیتا ہے کہ خیر اور کامیابی اسی میں ہے کہ انسان خالق کے احکامات کے سامنے اپنے سر کو جھکا دے دوسری صورت میں اُس کی دنیا اور آخرت دونوں اللہ کے عذاب کی زد میں آ جائیں گے

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ!

فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ (38) وَالَّذِينَ كَفَرواْ وَكَذَّبُواْ بِآيَاتِنَا أُولَـئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَO

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 2/38-39)

ترجمہ:

”تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی اُس کو نہ کوئی خوف ہوگا نہ کوئی غم اور جنھوں نے میری بات کو جھٹلا دیا اور نافرمانی کی تو وہی لوگ آگ میں ڈالے جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے“۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

سورہ الاعراف میں ارشاد ہوا کہ!

سَاء مَثَلاً الْقَوْمُ الَّذِينَ كَذَّبُواْ بِآيَاتِنَا وَأَنفُسَهُمْ كَانُواْ يَظْلِمُونَ (177) مَن يَهْدِ اللّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِي وَمَن يُضْلِلْ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (178) وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيراً مِّنَ الْجِنِّ وَالإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لاَّ يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لاَّ يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لاَّ يَسْمَعُونَ بِهَا أُوْلَـئِكَ كَالأَنْعَامِ

بَلْ ہُمْ أَضَلُّ أُوْلَـئِكَ ہُمُ الْغَافِلُونَ O

القرآن الحکیم (سورۃ الاعراف 7/177-179)

ترجمہ؛

’’حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہماری ہدایت سے انکار کرتے ہیں اُن کی حالت بہت ہی بری ہے اور حق سے انکار کرنے کی پاداش میں خود انھی کا نقصان ہے۔اللہ جس کو ہدایت دیتا ہے وہی ہدایت پانے والا ہے اور انکار کرنے والا ہمیشہ کے خسارے کا شکار ہو گیا۔اور ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہت بڑی تعداد کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔جن کے پاس دل ہیں مگر وہ سوچتے نہیں،اُن کے پاس کان ہیں مگر وہ سنتے نہیں اُن کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں،یہ لوگ جانور ہیں بلکہ جانوروں سے بھی گئے گزرے ہیں اور اُس کی وجہ اُن کی غفلت ہے۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

سورہ الاعراف میں ہی ارشاد ہوتا ہے کہ!

قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاء وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَـاةَ وَالَّذِينَ ہُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ (156) الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوباً عِندَہُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالإِنْجِيلِ يَأْمُرُہُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْہَاہُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَہُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْہِمُ الْخَبَآئِثَ وَيَضَعُ عَنْہُمْ إِصْرَہُمْ وَالأَغْلاَلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْہِمْ فَالَّذِينَ آمَنُواْ بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُواْ النُّورَ الَّذِيَ أُنزِلَ مَعَهُ أُوْلَـئِكَ ہُمُ الْمُفْلِحُونَ (157) قُلْ يَا أَيُّہَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعاً الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ لا إِلَـهَ إِلاَّ ہُوَ يُحْيِـي وَيُمِيتُ فَآمِنُواْ بِاللّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الأُمِّيِّ

الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَکَلِمَاتِہٖ وَاتَّبِعُوْہُ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الاعراف 156-158/7)

ترجمہ:

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اپنا عذاب اُسی پر نازل کرتا ہوں جس پر عذاب نازل کرنا چاہتا ہوں اور میری رحمت تو سب کو محیط ہے۔ اور میں ضرور اپنی رحمت اُن لوگوں پر نازل کروں گا جو اللہ سے ڈرتے ہیں، زکواۃ دیتے ہیں اور ہمارے احکامات پہ سر جھکاتے ہیں۔ اور جو لوگ رسول امی کی اطاعت کرتے ہیں جس کو وہ اپنی کتابوں میں لکھا ہوا پاتے ہیں تورات و انجیل میں تو رسول اللہ ﷺ اُن کو نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو اُن کے لیے حلال بناتے ہیں اُن پر سے وہ بوجھ اور بندشیں دور کرتے ہیں سو جو لوگ ہمارے نبی کی اطاعت کرتے ہیں اُن کی حمایت کرتے ہیں اُن کی مدد کرتے ہیں اور اُس ہدایت کی پیروی اختیار کرتے ہیں جو اُن کے ساتھ بھیجی گئی تو یہی لوگ ہیں جو پوری طرح کامیاب قرار پائیں گے۔ آپ فرما دیجئے کہ میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں جس کی بادشاہی زمینوں اور آسمانوں کو محیط ہے ۔اُس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت اتارتا ہے۔ سو اللہ پر ایمان لاؤ اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اُس ہدایت کو اختیار کرو جو اللہ کے رسول کی طرف اتاری جارہی ہے تاکہ راہ حق کو تمھارے لیے کشادہ کر دیا جائے''۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

اگرچہ انسانی فکر کی اصلاح کے لیے پورا قرآن ہی دستاویز ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے مگر نمونے کی اِن چند آیات پہ بھی اگر نگاہ تدبر دوڑائی جائے تو ہدایت حاصل ہو جانے اور فکر راست ہونے جانے کا قوی امکان موجود ہے۔ انسان کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ فکری طور پہ وہ راہ راست پہ ہو اس لیے کہ عمل کا دارومدار ہی فکر پہ ہے جب فکر راست ہوگی تو عمل بھی درست ہوگا اگر فکر غلط ہوگی تو انسانی عمل اُس عمارت کی طرح گر جائے گا جس کی بنیاد ٹیڑھی تھی اور جونہی وہ ذرا بلند ہوئی تو دھڑام سے گر گئی۔ پیام بہت واضح ہے

جس میں کوئی ابہام نہیں۔اللہ تعالیٰ کے انبیاء انسان کو ایک ہی نقطہ کی طرف بلاتے رہے جسے توحید کہا جاتا ہے چنانچہ فرمایا گیا کہ ایک اللہ کی عبادت کرو اور اُس کے ساتھ کسی کو شرک مت ٹھہراؤ۔ہزاروں لاکھوں پیامبر اسی بنیادی پیغام کی تجدید کے لیے اترتے رہے۔مگر حیرت ہے کہ انسان ہمیشہ سے انکار پہ اڑا رہا اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتا رہا۔آج کے لوگ خود کو مہذب کہتے ہیں خود کو عقل مند اور صاحب دانش قرار دیتے ہیں اور اس میں کوئی شک بھی نہیں انسان نے اپنی زندگی میں عقل کے سہارے اس قدر سہولیات اور آسائشات پیدا کر لی ہیں کہ اُس کو بے عقل تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا مگر یہ انسانی زندگی کا مادی پہلو ہے جس میں اُس نے ترقی کی۔اُس کا روحانی پہلو نہایت تشنہ ہے اس لیے کہ NASA میں بیٹھنے والا امریکی خلا باز بھی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے تو چاند کی سرزمین پہ اترنے والا اور دور خلائی اسٹیشنوں میں مہینوں گزارنے والا خلانورد بھی اللہ کی حقیقت سے اُسی طرح ناآشنا ہے جیسے کہ ہندوستان کے دور دیہات میں بسنے والا بتوں کا کوئی پجاری۔وال اسٹریٹ جنرل میں بیٹھنے والا تاجر جو دنیا کی تجارت کو لمحوں میں کسی بحران کے حوالے کرنے پہ مختار ہے وہ بھی اللہ کی حقیقت سے آگاہ نہیں تو ناروے اور آسٹریلیا کے ساحلوں پر عریاں بدن عورتیں بھی اللہ کی منشا سے منہ موڑے ہوئی ہیں۔چین کا نہایت محنتی کاشتکار اور روس کا فوجی بھی اللہ کی ہدایت سے انکاری ہے بلکہ وہ تو کسی اللہ کے وجود سے ہی انکاری ہیں تو اس سے ثابت ہوا کہ بظاہر کچھ مادی میدانوں میں کامیابی حاصل کر لینے کے باجود انسان گمراہ ہو سکتا ہے۔

لہراتی روشنیوں اور تیز رفتاری سے دوڑتی ٹریفک اور ہواؤں کو چیرتے ہوائی جہاز انسان کی کامیابی کے ضامن ہرگز نہیں ہیں اس لیے کہ اللہ کے نزدیک یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔بڑا کارنامہ تو صرف اور صرف اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے، جنت کا حقدار بننا ہے۔آخرت میں کامیابی حاصل کرنا ہے چاہے اُس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے، چاہے اُس کامیابی کے عوض اس دنیا کی زندگی کس قدر ہی دشوار کیوں نہ ہو جائے۔چنانچہ انسان کو سوچنا چاہیے کہ اُسے کیوں پیدا کیا گیا ہے اور اُس کی زندگی کا مقصد کیا ہے، کیا مادی کامیابی کا حقیقی کامیابی سے کوئی تعلق ہے اس بات کو سوچنے سے ہی فکری اصلاح کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور اس کے بعد عمل درست بنیادوں پہ خود ہی استوار ہو جائے گا اس لیے کہ مضبوط اور سیدھی بنیادوں پہ اٹھائی جانے والی عمارت کبھی نہیں گرتی۔لوگوں نے جب حقیقت سے انحراف کیا، حق سے منہ موڑا اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرایا تو اُس عقائدی بگاڑ نے جنم لیا جس نے لوگوں کی کثیر تعداد کو راہ حق سے اکھاڑ پھینکا اور اُن کو آگ کا ایندھن بنا کے رکھ دیا۔اسلام نے لوگوں پر اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ اللہ ہی کی عبادت کی جائے

گی اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے گا اس لیے کہ اللہ ہی خالق ہے، اللہ ہی مالک ہے، اللہ ہی رب ہے، اللہ ہی مدبر کائنات ہے، اللہ ہی غالب ہے، حکمت صرف اللہ کے لیے ہے، رحمت اُس کی صفت ہے اور قہر اُس کا عذاب ہے۔ زمین بھی اُسی کی ہے اور آسمان بھی اُسی کا ہے۔ جو کچھ اس کے بیچ ہے اُس کا مالک بھی وہی ہے۔ لہٰذا وہ اس بات کا حق دار ہے کہ انسان اس کی عبادت کرے اور اُس کے ساتھ کسی کو شرک نہ ٹھہرائے۔ اس کائنات میں بے شمار نشانیاں ہیں جو انسان کو اس امر کی طرف متوجہ کرتی ہیں کہ اللہ ہی غالب ہے وہی حکمت والا ہے اور اسی نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے تا کہ اُس کی اطاعت کی جائے اور وہ لوگوں پہ رحم کرے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ!

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (190) الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ○

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران 3/190-191)

ترجمہ؛

”بلاشبہ آسمانوں اور زمینوں کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے۔ جن کی حالت یہ ہے کہ وہ یاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے بھی اور وہ غور کرتے ہیں زمین و آسمان کی پیدائش میں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس زمین کو یونہی بلا مقصد پیدا نہیں فرمایا اس لیے کہ آپ عبث کاموں سے پاک ہیں“۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

چنانچہ کائنات کی ماہیت پکار پکار کے اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اللہ ایک ہی ہے جو اس نظم

کائنات کو چلا رہا ہے اگر اللہ ایک سے زیادہ ہوتے اور کائنات ایک سے زیادہ حکموں کی پابند ہوتی تو کب کی تباہ ہو چکی ہوتی۔ زمین و آسمان کی گردش دن اور رات کے آنے جانے میں اور بدلتے موسموں میں لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو اُس کی رہنمائی خالص توحید کی طرف کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان خالق کی رہنمائی کا محتاج ہے، وہ عقل کے سہارے کبھی بھی منزل تک نہیں پہنچ سکتا بلکہ منزل کے حصول کے لیے انسان کو اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء و رسل پہ ایمان لانا ہوگا، اللہ کے احکامات اور اللہ کی کتابوں پہ ایمان لانا ہوگا، تب وہ منزل تک پہنچ سکے گا۔ عقل کی حد ادراک محدود ہے اور وہ کائنات کی لامحدود وسعتوں کا احاطہ نہیں کر سکتی چنانچہ جہاں سے عقل کی حد ختم ہوتی ہے وہیں سے وحی الٰہی کا آغاز ہوتا ہے جو انسان کی انگلی تھام کر اُسے منزل تک پہنچاتی ہے۔ اب اگر انسان اللہ کے نبی کا دامن چھوڑ دے وحی سے گریز اختیار کر لے اور پھر بھی منزل حاصل کر لینے کا دعویٰ کرے تو اسے دیوانے کی بڑھ ہی جانا جائے گا۔ چنانچہ درست عقیدہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اس بات پر یقین حاصل کیا جائے کہ اللہ نے اس کائنات کو عبث پیدا نہیں کیا بلکہ اس زندگی کو انسان کے لیے دارالعمل بنایا گیا ہے اور موت کی بعد کی زندگی کو دارالجزاء قرار دیا گیا ہے یہی اصل عقیدہ ہے اور یہی زندگی کی حقیقت۔ قرآن حکیم کی آیات سے عقیدہ و عمل کی درستگی کے لیے ہدایات حاصل کی جاتی ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ!

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ المومنون 12/11)

ترجمہ:

”ہاں تو کیا تم نے یہ خیال کیا ہے کہ ہم نے تم کو یونہی مہمل خالی از حکمت پیدا کیا ہے اور تم لوٹ کر ہمارے پاس نہ آؤ گے“۔



سورہ العنکبوت میں ارشاد ہوتا ہے کہ!

وَمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ العنکبوت 64/29)

ترجمہ؛

''اور یہ دنیا کی زندگی تو محض کھیل تماشا ہے حقیقت یہ ہے کہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے اگر اُن کو علم ہوتا تو وہ ایسا ہرگز نہ کرتے''۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

سورہ الکہف میں ارشاد ہوتا ہے کہ!

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً ○ وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيداً جُرُزاً ○

القرآن الحکیم (سورۃ الکہف 7/18)

ترجمہ؛

''ہم نے زمین کی چیزوں کو انسان کے لیے باعث رونق بنایا تا کہ اس کی آزمائش کرسکیں کہ اِن میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے اور زمین کی تمام چیزوں کو ایک روز ہم فنا کردیں گے''۔

⊖⊖⊖⊖⊖⊖

سورہ الملک میں فرمایا کہ!

تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (1)
الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ
عَمَلاً وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ (2) الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ
طِبَاقاً مَّا تَرَى فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِن تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ

ہَل تَرَىٰ مِن فُطُورٍ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الملک 1-3/67)

ترجمہ:

”خدا بڑا عالیشان ہے جس کے قبضہ وقدرت میں ساری کائنات ہے۔اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔اُسی نے موت وحیات کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرنے والا ہے وہ زبردست ہے اور بخشنے والا ہے۔اُس نے سات آسمان اوپر تلے پیدا کیے اور تو اُس کی کاریگری میں کوئی کمی نہ پائے گا“۔



سورہ الجاثیہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ!

وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (22) أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الجاثیہ 21-23/45)

ترجمہ؛

”اللہ نے زمین وآسمان کو برحق پیدا کیا ہے تا کہ ہر شخص کو اُس کے عمل کا بدلہ دیا جا سکے اور وہاں کسی کے ساتھ ظلم نہ کیا جائے گا۔کیا آپ نے اُس شخص کی حالت دیکھی ہے جس نے اپنے نفس کو خدا بنا رکھا ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے اس کو سمجھ بوجھ کے باوجود گمراہ کر دیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے تو اب اس کو کون ہدایت دے گا؟؟؟



مزید ارشاد ہوتا ہے کہ!

قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (26) وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَخْسَرُ الْمُبْطِلُونَ (27) وَتَرَى كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَى إِلَى كِتَابِهَا الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ O

القرآن الحکیم (سورۃ الجاثیہ 26-28/45)

ترجمہ؛

''کہہ دیجئے کہ اللہ ہی تم کو زندہ کرتا ہے اور اللہ ہی جب چاہے گا تم کو موت دے گا اور قیامت کے دن جس کے ہونے میں ذرا بھی شک نہیں لوگوں کو اکٹھا کرے گا اگرچہ اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں۔ اور اللہ ہی کی حکمرانی ہے زمین میں اور آسمانوں میں اور محشر کے روز جس روز انکار کرنے والے خسارے میں پڑ جائیں گے۔ اُس روز آپ دیکھیں گے کہ ہر گروہ خوف کے مارے گرا جاتا ہے جہاں ہر ایک کو نامہ اعمال کی طرف بلایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ آج تم کو تمہارے عمل کا ٹھیک ٹھیک بدلہ دے دیا جائے گا''۔



سورہ آل عمران میں فرمایا کہ!

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَن زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ O

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران 185/3)

ترجمہ؛

''ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو پورا بدلہ قیامت کے روز ہی دیا جائے گا اور جو شخص دوزخ کی آگ سے بچ گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہی کامیاب قرار پائے گا۔ اور دنیا

کی زندگی تو کچھ بھی نہیں صرف دھوکے کا سودا ہے"۔



یہ زندگی کا ایک جامع تصور ہے جو اسلام نے پیش کیا۔ اسلام انسان کی توجہ آخرت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہے۔ اسلام کے نزدیک یہ زندگی ایک دھوکہ ہے، آخرت کی زندگی کا محض سایہ ہے۔ اس زندگی میں انسان کو عمل کی کسوٹی پہ پرکھا جائے گا۔ اگر اُس کا عمل خالق کی منشا کے مطابق ہوا تو موت کے بعد اُس پہ انعام و اکرام کی بارش کر دی جائے گی اور اُسے ایسی جنتوں میں داخل کیا جائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اِن جنتوں کا حق دار قرار پائے گا۔ زندگی کا یہ تصور اُس کے تقریباً برعکس ہے جو آج کے لوگوں کی اکثریت نے اپنا لیا ہے لوگوں کی اکثریت جو خطہ ارض پہ بستی ہے اسی دنیا میں اُس خوشی، اُس سکون، اُسی ابدی راحت کی متلاشی ہے جو جنت میں ملنے والی ہے۔ تاہم یہ دنیا چونکہ جنت نہیں ہے بلکہ جنت کے حصول کی جدوجہد کا مقام ہے اس لیے انسان کو جب خوشی نہیں ملتی راحت نہیں ملتی تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے اگرچہ عقل اُس کی رہنمائی کے لیے موجود ہے لیکن انسان اپنی تمام مصیبتوں اور تمام دکھوں کا حل عقل سے دریافت کرتا ہے اور علم وحی سے گریزاں رہتا ہے۔ چنانچہ وہ عقل جس کو خود منزل کا علم نہیں وہ انسان کو منزل پر کس طرح لے جا سکتی ہے عقل انسان کی رہبر ضرور ہے۔

عقل انسان کو اللہ کی اطاعت اور خالق کی رحمت کی طرف لے جانا بھی چاہتی ہے مگر انسان کی تربیت جس ماحول اور جس پس منظر میں ہوتی ہے وہ ماحول اور اُس کا پس منظر اُسے حقیقت تک جانے ہی نہیں دیتا اس لیے کہ جن تعلیمی اداروں نے اُس کی تربیت کی تھی جن اساتذہ نے اُسے پہلا لفظ پڑھایا تھا انھوں نے اُس کو بتایا تھا کہ یہ کائنات خود بخود ہی وجود میں آ گئی تھی اور اِس کا کوئی خالق نہیں ہے انسان بندر کی اولاد ہے اور بندر سے ترقی کرتا کرتا وہ انسانی شکل تک پہنچا ہے۔ لہٰذا وہ کسی خالق کے وجود پر یقین کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتا اور جب اُس کا کوئی خالق نہیں، کوئی معبود نہیں تب وہ اپنے دکھ اپنی پریشانیاں کس سے بیان کرے۔ چنانچہ انسان بھری دنیا میں تنہا رہ جاتا ہے اور ناامیدی اور قنوطیت کا شکار ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ خالق سے مزید دور ہو جاتا ہے۔ انسان زندگی کی ہماہمی میں صرف اور صرف مادی اہداف مقرر کرتا ہے اور انہی اہداف کے حصول کے لیے سرگرم رہتا ہے، اُس کی زندگی کا بیشتر وقت انھی اہداف کے تعاقب میں گزر جاتا ہے اور بعض اوقات تو اسے کسی خالق کے وجود کا احساس تک نہیں ہوتا تاہم وقت چونکہ بدلتا رہتا

ہے اور ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا اس لیے کسی تاریک رات میں کسی بھیانک منظر میں کسی انہونے واقعے سے اُسے خالق کی یاد ضرور آتی ہے۔ آخر کسی خالق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے مگر جونہی انسان اُس برے وقت سے باہر آتا ہے تو خالق کا شکر ادا کرنا بھول جاتا ہے۔ مادیت کی سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ انسان کبھی بھی شکر کی راہ پہ نہیں جاتا اُسے زندگی میں جو بھی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں اور جن اہداف کو بھی حاصل کر پاتا ہے اُسے وہ اپنی محنت کا نتیجہ جانتا ہے اور اپنی کامیابی میں خالق کے کسی احسان کو یاد نہیں کرتا۔ چنانچہ جب وہ کسی کا احسان مند ہی نہیں تو اُسے کسی کا شکر ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے اور انسان کی ساری زندگی خالق کی احسان مندی سے خالی گزر جاتی ہے۔ مگر جلد ہی وہ وقت آجاتا ہے جب انسان کے اعضاء میں کمزوری آجاتی ہے، جب اُسے معاشرے کا جزو معطل قرار دے دیا جاتا ہے تب اُس کی اولاد اُس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے اُس کے ماتحت اُسے نظر نہیں آتے زندگی کی وہ رونقیں جنھیں وہ ہمیشہ رہنے والی سمجھ بیٹھا تھا اُس سے روٹھ جاتی ہیں اور انسان ایک دم سوچنے لگتا ہے کہ یہ اُس کے ساتھ کیا ہو گیا۔ تب انھی راتوں میں اُسے موت کی یاد آتی اور موت کا خوف اُسے گھیر لیتا ہے اُسے نیند نہیں آتی کھانا ہضم نہیں ہوتا اور اُس کی زندگی اس قدر بے مصرف اور بے زار ہو جاتی ہے کہ اُسے اپنا بد انجام نظر آنے لگتا ہے۔ مگر وہ وقت جب اُسے خالق کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے تھی وہ اسے پیچھے چھوڑ آیا ہوتا ہے اس لیے سوائے مایوسی کے اب اس کا کوئی ساتھی نہیں۔ یاد رہے کہ جب انسان اپنے خالق کی اطاعت میں زندگی گزارتا ہے تو کسی بھی قسم کی محرومی اور اذیت سے محفوظ رہتا ہے اس لیے کہ تب وہ مصیبت کو امتحان، دکھ اور پریشانی کو خالق کی آزمائش جانتا ہے اور اپنے رب سے دُعا کرتا ہے کہ اے میرے مالک مجھے اس مصیبت سے نجات عطا فرما، اگر فوری طور پہ اُس کی دُعا قبول نہ بھی کی جائے تب بھی اُس کی امید کا دامن ہرا رہتا ہے۔

چنانچہ اسلام دنیا کے مقابلے میں آخرت پہ زور دیتا ہے اور انسان کو آخروی کامیابی کے حصول کی جدوجہد کے لیے تیار کرتا ہے۔ اسلام انسان کو بتاتا ہے کہ یہ زندگی ہی آخروی زندگی میں کامیابی کی اصل ضمانت ہے اس لیے اس زندگی کے لمحہ لمحہ کو خالق کی اطاعت میں بسر کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ پاک صاف رہنا چاہیے کہ کیا پتا کب بلاوا آجائے۔ اللہ کی اطاعت میں زندگی بسر کرنے سے انسان اس قدر محتاط ہو جاتا ہے کہ وہ کسی سے زیادتی نہیں کرتا کسی کا مال نہیں کھاتا اُس کے حلق سے کوئی لقمہ حرام نہیں اترتا۔ چنانچہ یہی وہ اعلیٰ اخلاقی خصائص ہیں جو اسلام کا مطلوب ہیں جن کے نتیجے میں انسان اس دنیا میں بھی معاشرے کا عمدہ اور سچا فرد ثابت ہوتا ہے اور سماج میں اُس کو نمونہ قرار دیا جاتا ہے جس کی پیروی کی خواہش کی جاتی ہے۔ چنانچہ اگر

سماج کے اکثر لوگ خالق کی اطاعت میں زندگی بسر کرنے لگیں تو یہی دنیا جنت کا منظر پیش کرنے لگ جائے اور ہر طرف امن وسکون ہو جائے مگر آج کی دنیا جو ہماری نظروں کے سامنے ہے وہ اس قدر بھیانک منظروں سے پُر ہے کہ ہر منظر خالق سے بے اعتنائی کا مظہر ہے۔ اور اِن بھیانک منظروں کے پس منظر میں عقیدے کا بگاڑ ہی بنیادی بگاڑ ہے۔ چنانچہ عقیدے کے بگاڑ کی درستگی کے لیے علم حاصل کرنا چاہیے، جہد وسعی کرنا چاہیے کہ جب عقیدہ صحیح ہوگا تو ہر قدم درست سمت کو ہی اٹھے گا۔ اللہ ہماری رہنمائی فرمائے۔ آمین





القرآن الحکیم

صحیح بخاری ۔۔۔۔ امام بخاری

صحیح مسلم ۔۔۔۔ امام مسلم

مشکواۃ ۔۔۔۔ امام محمد رازی

مقدمہ ابن خلدون ۔۔۔ابن خلدون

اسلام اور عصر حاضر ۔۔۔ مولانا وحید الدین

بست و کشاد ۔۔۔ پروفیسر احمد رفیق اختر

چراغ سر راہ ۔۔۔ پروفیسر احمد رفیق اختر

پیمان ازل ۔۔۔ پروفیسر احمد رفیق اختر

اٹھتے ہیں حجاب آخر۔۔۔ پروفیسر احمد رفیق اختر

اسلام اور عصر حاضر۔۔۔ مولانا وحید الدین

روایات تمدن قدیم۔۔۔۔ علی عباس جلالپوری

خطبات بہاولپوری۔۔۔ ڈاکٹر حمید اللہ

اسلام اور عصر حاضر۔۔۔ پروفیسر احمد رفیق اختر

کائنات اور انسان۔۔۔۔ علی عباس جلالپوری

تفصیل الازمنہ۔۔۔ یوسف بن عبدالمالک

مسلمانوں کا اقتدار۔۔۔ پروفیسر ارشد جاوید

قرآن اور جدید سائنس۔۔۔۔ ڈاکٹر حشمت جاہ

رسول عربی اور عصر جدید۔۔۔سیّد اسماعیل

تفصیل الازمنہ۔۔ یوسف بن عبدالمالك

مسلمانوں کا اقتدار۔۔۔ پروفیسر ارشد جاوید

قرآن اور جدید سائنس۔۔۔۔ ڈاکٹر حشمت جاہ

رسول عربی اور عصر جدید۔۔۔سیّد اسماعیل

علم کی اسلامی تشکیل۔۔۔ خورشید احمد ندیم

قیامت اور جدید سائنس۔۔۔ ڈاکٹر حشمت جاہ

تاریخ الاسلامی السیاسی۔۔۔۔ڈاکٹر حسن ابراهیم

النظم الاسلامیہ۔۔۔۔ ڈاکٹر حسن ابراهیم

مسلم نشاۃ ثانیہ۔۔۔۔ ڈاکٹر محمد امین

مسلمان اور سائنس۔۔۔ڈاکٹر محمد حبیب

نامور مسلمان سائنسدان۔۔۔حسن عسکری

یورپ پر اسلام کے احسانات۔۔۔ غلام جیلانی برق

مابعد جدیدیت اور اسلام۔۔۔ڈاکٹر احمد ندیم

قوموں کا عروج و زوال۔۔۔ ڈاکٹر آغا

جدیدیت۔۔۔ پروفیسر حسن عسکری

فرائیڈ کی نفسیات۔۔۔ شہزاد احمد

معرکۂ مذہب و سائنس۔۔۔ظفر علی خان

اسلام کا نظام تربیت۔۔۔ محمد قطب

مابعد جدیدیت نظری مباحث۔۔۔۔ڈاکٹر ناصر عباس

مابعد جدیدیت۔۔۔۔ نظام صدیقی

Westren Authors.

Man God & Immortalilty. by; G.J.Freezaer

Mater,Eather,Motion by; Dr, Dalbeer.

Religion Without Revolation.by; Dr, J.Heksely.

History of Arabs.by; Philps Hitty.

Paradigm for the third Millenniuam.by; Janecs Chalers

The New Tolerance , Carol StremBy; Bob Hostler.

The Post Modren Condition.By; Jean Francos

Post Modrenism and its Crities By ; Shannon weies

Travels in Hyperreality. By: Umberto Eco.

Modren Science & Nature. By ; Willines beeak.

The postmodren Turn.By ; Ohio University Press

Religion of the semites. By;Robert Smith

The Conquest of Happiness. By;RussallBurtrand

Religion of Erabs. By;Robert Semith

Glance at Historical Materialism.By ; A .Spirken.

Pleasure Thinking. By ; Fried.

Origion of Species. By;S, Charles Darwen

His Dream & Sex Theories. By;Freud

Modren Islimic Thought. By;Sir jamees jeen

Fall of west. By;Springler.

Modren Islimic Though. By;Sir jamees jeen

The making of Humanity. By;Briffault

The age of analysis. By;Edendton

The Spirit of Islam. By;Ameer Ali

Modern Science & natur Life By ;W Back

History of Religion. By; Trawleing

History of civiliazation. By;B, Russiall

The age of faith By;well deurant

Human Understanding by;Dr. Hehoom

Human Destiny. By;Pierre Lecomde

Religion of the semites. By;Robert Smith

Human Destiny. By; Pierre Lecomde

Matter and Motion. By;Tyndall

The Limitations of Science. By;MORTEN WHITE

The Ultimate Miracle. By;Dr, Dedat

Towards understandin Qurran. By; Dr,Zafar,